مُفتی جی اور مَیں

ممتاز مفتی کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یادیں

فرحین چودھری

تصنیف	میں اور مفتی جی
مصنفہ	فرحین چودھری
پبلیشر	صریر پبلیکیشنز
پیش لفظ	فرحین چودھری
دیباچہ	عکسی مفتی

انتساب

ان لمحوں کے نام جنہوں نے مجھے احساس میں

بھگو کر میرا قلم سے رشتہ جوڑا

پڑھنے والوں کے نام

دوستی اور وہ بھی عقیدت بھری، بندے کا کچھ نہیں چھوڑتی

ویسے بھی ایک چیونٹی کی کسی پہاڑ یا چشمے سے کیا نسبت؟

پر چیونٹی اتنا تو کر سکتی ہے نا کہ وہ حد نظر تک انہیں دیکھ کر ان کی عظمت کو سلام کر لے

یہ کتاب ایک معصومانہ سا سلام ہے

بھیدوں بھرے مفتی جی اور اللہ کے سیکرٹ ایجنٹ قدرت اللہ شہاب کے نام

آپ کی رایے مختلف ہو سکتی ہے مجھ سے، مگر جو مجھ پر بیتی اور جیسے بیتی پوری سچایی کے ساتھ بیان کر دی

نصیر احمد ناصر کی ممنون ہوں جنہوں نے میرے

اندر باہر جگہ جگہ بکھرے اوراق کو سمیٹنے پر اکسایا

اس دور میں کتابوں پر جان و مال لٹانے والے صریر پبلیکیشنز کے لیے ڈھیروں دعاییں

فرحین چودھری

مارچ ۲۰۲۰ ء

اسلام آباد

دیباچہ

میں نے فرحین کی کتاب 'میں اور مفتی جی' پڑھی نہیں

فرحین نے خود مجھے پڑھ کر سنایی

پڑھتے پڑھتے وہ آبدیدہ ہو جاتی

اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

میں حیران تھا فرحین کی عمر ہی کیا تھی جب وہ پہلی بار ہمارے گھر آیی، مفتی جی کے گھر

مفتی جی اسی پچاسی سال کا علیل بوڑھا

فرحین ایم اے کی طالبہ

ممتاز مفتی کو بزرگ بننے سے چڑ تھی، وہ خاندان کے بزرگوں کے ڈسے ہوے تھے

رشتے داروں سے تو وہ پہلے ہی کٹ چکے تھے

ان کا خیال تھا کہ ساری شرارت جذبہ احترام کی ہے، جو ہر دو اشخاص کے درمیان دیواریں بن جاتا ھے۔ احترام کے جذبے نے ایک دوسرے سے کاٹ کے رکھ دیا ہے۔

دور کر دیا ہے۔

مجھے کہتے عکسی نہ تمہارا ماما ہے نہ چاچا، نہ تایا ہے، ہاں دوست ہیں

دوست رکھو۔

ممتاز مفتی کے نزدیک ایک ہی رشتہ تھا، دوستی

اٹھارہ سال کی لڑکی یا اٹھاسی سال کا بزرگ، ممتاز مفتی کا بے تکلف دوست ہی ہوتا

فرحین کو بھی ممتاز مفتی نے دوستی کا ہی درجہ دیا

وہ باپ بن کر دوسرے کو نصیحت نہیں کرتے تھے، کوئی فیصلہ کسی پر مسلط نہیں کرتے تھے چاہے وہ کتنا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ ینگ جنریشن کی بات بڑے غور سے سنتے، اسے اہمیت دیتے۔

اسے سنتے، اپنی نہ کہتے

شاید یہی وجہ ہے لوگ ممتاز مفتی کی جانب کھنچے چلے آتے۔

فرحین نے بھی ممتاز مفتی سے دوستی خوب نبھائی

آپ مفتی جی کو کچھ کہہ کر تو دیکھیں، آج بھی فرحین تلوار کھینچ لیتی ہے

اپنی زبان کے خنجر سے ایسے الفاظ کہے گی کہ زخمی کر دے گی

فرحین کی کتاب 'میں اور ممتاز مفتی' ایک اہم اضافہ ہے

ممتاز مفتی پر اور بھی کتابیں لکھی گییں لیکن فرحین کی یہ کتاب منفرد حیثیت رکھتی ہے

عکسی مفتی

مارچ ۲۰۲۰ ے

پی این ایس فارمز اسلام آباد

ابواب

مضامین

اللہ لوک کا ڈھابہ

گلی نمبر ۳۲ سیکٹر ایف سکس، اسلام آباد

ذرا نشیب پر واقع ایک گھر جس کے ساتھ ہی گھومتی سڑک پر چھوٹی سی پلی جس کے نیچے سے نالہ بہتا ھے۔ ایسے نالے اسلام آباد کے ہر سیکٹر میں موجود ھیں۔

کچھ گندے نالے اور کچھ صاف نالے۔

بلکہ ہر بستی صاف اور گندے نالوں سے بھری پڑی ھے۔

مگر یہاں ایک صاف نالہ بہتا تھا۔

گھر کافی ڈھلان پر تھا جب یہ جگہ لی گیی تھی تو اس درمیانے سے سایز کا پلاٹ دس پندرہ ہزار میں ملتا تھا۔ نشیبی ہونے کے باعث اور نالے کی قربت کی وجہ سے قیمت مزید کم ہو جاتی تھی۔

لان کی ادھ کھایی سی اداس گھاس شکوہ کناں رہتی کہ سڑک کی جانب والی دیوار کی اونچایی نے اس کے حصے کی دھوپ پر سالہا سال سے قبضہ کر رکھا تھا۔ معصوم گھاس کیا جانے کہ یہاں تو قد آور درختوں کی دھوپ روک لی جاتی ھے ان کے چھایوں پر پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔

"!!وہ تو محض گھاس ہے پایوں تلے روندے جانے کے لیے

گیٹ سڑک کے برابر تھا مگر گھر کا ڈرایبو وے کم جگہ کے باعث ایسی ترائی بنا تا تھا کہ اترتے سمے چال دوڑ کے مشابہہ لگتی۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی نالے کی جانب گھنا سبزہ اور اونچے اونچے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے راز داری کے ساتھ بہنے والا نالہ اس وقت بدبودار نہ تھا۔

جانے آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شفاف نالے معطر ہونے کی بجایے گندے نالوں میں کیوں تبدیل ہونے لگتے ہیں؟

یہ سوال مجھے اکثر تنگ کرتا ہے۔

مکیں وں نے گھر اور درختوں کے درمیان والی جگہ کو صاف کر کے اچھے خاصے لان کا روپ دے دیا تھا۔ جہاں درختوں پر رنگ برنگے پرندے آتے، بیٹھتے اور اڑ جاتے۔ اس جگہ چند پالتو مور آزادانہ گھومتے، پھرتے آنے جانے والوں کا دل بہلاتے۔

سردیوں کی چمکتی دھوپ میں وہاں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے والے سانولے منحنی سے انسان کوی اور نہیں ممتاز مفتی تھے۔

ایک عہد ساز لکھاری ایک ادبی دیو، جن کے گرد درجنوں بالشتیے گھومتے رہتے۔ مفتی جی ایک محبت کرنے والا دل، اونچ نیچ کے چکر سے آزاد، سب کو لکھنے پڑھنے کی ترغیب دیتے بحث کرتے لڑتے جھگڑتے قلم کی خاطر!۔

مجھے بھی باربار جانچنے کو کہتے، ''چھڈاے لکھنا پڑھنا دکھی رہویں گی''۔

''میں جواب دیتی، ''لکھنا پڑھنا میری سانسوں جیسا ہے اس کے بغیر مر جاہوں گی

''ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے، ''تے فیر روز لکھیا کر

میں کہتی، ''لکھوں گی اور اپنی مرضی سے لکھوں گی جب جب جیسے اور جو دل چاہے گا''۔

میری اس بات پر ان کی آنکھوں میں خوشی کی عجیب سی چمک لہراتی۔ انہیں من مانی کرنے والی آزاد روحیں جن کا قلم سے رشتہ ہو،

خاص طور پر اچھی لگتی تھیں۔ لیکن ان کے نزدیک 'من مانی' اور آزادی کا بھی ایک معیار تھا۔

جس میں کسی کی ذات کو، کسی گروہ کو نقصان پہنچانا، کسی کا راستہ روکنا گناہ تھا۔

مفتی جی کے گھر کا دروازہ رات گیے تک کھلا رہتا گیٹ با نہیں وا کیے رہتا۔ بلکہ پورچ کا دروازہ بھی سردی گرمی میں کبھی کسی نے رات ۱۲ بجے بھی مقفل نہیں پایا۔

نہ دل پر تالے نہ در پر تالے !!۔

بلا روک ٹوک، بلا اطلاع لوگ دور دور سے چلے آتے۔ مفتی جی سے نہ صرف ان کے ساتھیوں بلکہ ہزار ہا لوگوں نے فیض پایا۔

اپنا اپنا ظرف، کویی مانتا ھے کویی نہیں مانتا

!۔ ویسے بھی چشمے کو کیا پرواہ اس کا پانی انسان پیے یا جانور

ستمبر ۱۹۰۶ میں مفتی جی دنیا میں آیے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۵ کو وصال ہوا۔ یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ھے کہ ۱۱

یہ تواریخ اور سال پاکستان کے قیام کے آغاز (۱۹۰۶ میں مسلم لیگ قاییم ہویی تھی) اور دفاٰع پاکستان کے حوالے سے بھی اہم ھیں۔

اس 'وصال' پر ان کا ایسا ایمان تھا کہ وصیت کے مطابق ان کی 'رخصتی' پر عکسی مفتی نے قوالی کا انتظام کیا تھا۔ کچھ لوگوں کے ماتھوں پر تیوریاں تھیں کچھ لبے کھسر پھسر بھی کی

! مگر عکسی بھی تو ممتاز مفتی کا ہی بیٹا تھا نا۔ اسے بھی کسی تیوری کی پرواہ تھی نہ کھر پھسر کی

ہر ذی روح کے ذمے قدرت کوئی نہ کوئی خاص کام لگاتی ھے۔ مفتی جی کی بہت ساری ڈیوٹیاں تھیں۔ جن میں سے ایک ڈیوٹی خیر بانٹنا تھی بلا تخصیص عمر، نسل، ذات، رتبہ اور جنس۔ اس در پر جو بھی آیا اس نے فیض پایا مگر اپنے !اپنے ظرف کے مطابق

! چھوٹے برتن اپنے حجم سے زیادہ بھرے جائیں تو چھلک جاتے ہیں

جانے وہ ولی تھے معالج تھے یا محض اعلی صفات کے حامل ایک غیر معمولی انسان؟۔ جو بھی تھے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی ہجوم سے الگ اور منفرد۔ دراصل کسی بھی خاص انسان یا خاص چیز کو دیکھنے والی آنکھ اور اسے پہچاننے والا دل بھی خاص ہی چاہیے ہوتا ہے۔

سوسطحی سوچ والے ان کی عظمت کو کیسے جانچتے؟ ممتاز مفتی کون تھے ان کا اصل کام کیا تھا؟ یہ پہچان کم ظرفوں کو کیسے ہوتی جنہیں اپنی ناک سے آگے کا منظر دکھائی ہی نہیں دیتا۔

ان کی ذات ٹھنڈے میٹھے چشمے جیسی تھی جیسے چشمہ پیاسے کی پیاس بجھاتے وقت اس کا نام ونسب نہیں پوچھتا

اسی طرح مفتی جی نے بھی آنے والوں سے اگر پوچھا بھی تو اتنا، "آپ کا مسلہ کیا ھے"؟ پھر جھولیاں بھر بھر بھیجا۔ نایاب مشوروں، باتوں اور دعایوں کے ساتھ ساتھ ہومیو پیتھک پڑیوں کی سوغات بھی بانٹی۔

ان کی ذات اور زندگی کے سمندر میں بھی جانے کتنے بھنور اور تلاطم تھے۔ مگر وہ دوسروں میں خوشیاں بانٹتے رہے، دوسروں کی کثافتیں اپنے شفاف پانیوں میں دھوتے رہے۔

وہ خود کہتے تھے کہ ان میں غصے کی وہ شدت تھی کہ دھول اڑا دیتی تھی۔ (بحوالہ 'اوکھے اولڑے'۔ ان کی یہ کتاب اپنے قریبی احباب کے خاکوں پر مشتمل ہے جس میں اس ناچیز پر بھی انہوں خاکہ لکھا تھا اس خاکے کا عنوان ہے 'بلبلے' جو میرے پہلے افسانوی مجموّعے 'سچے جھوٹ' میں شامل ھے کیوں کہ یہ خاکہ دراصل اس کتاب کے لیے ہی لکھا گیا تھا تب میں شہابہ گیلانی کہلاتی تھی)

جب میں انہیں ملی، ایک طالبہ تھی اور وہ اسی سالہ ایک ایسا کویلہ جس کی دہکن میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھی۔ ان پھلجھڑیوں جیسی جنہیں میں بچپن میں جلا کر ہاتھوں میں لیے بھاگتی تھی اور چنگاریاں کبھی ہاتھ نہ جلاتیں۔

مفتی جی کی باتیں، ان کی تحریریں پھلجھڑیاں ہی تو تھیں۔ بیماری اور اتنی عمر کے باوجود لہجے میں شگفتگی، باتوں میں شرارت اور حاضر دماغی ایسی کہ بندہ ششدر رہ جاتا۔ انہیں اپنے تمام ملنے جلنے والوں، لکھاریوں اور دنیا بھر میں پھیلے مداحوں کے بارے میں سب کچھ یاد ہوتا۔

کس کا کیا مسلہ ہے، کسے کب خط لکھنا ہے، کس کی کب آمد ہے؟ اور اس کے ساتھ ریڈیو کے سکرپٹ بھی آخری دنوں تک لکھتے رہے۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں نکل گیی۔ چھوٹے لان کے سامنے ڈرائینگ روم تھا شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے بیچ میں ہی شیشے کا دروازہ۔ کویی حفاظتی گرل تھی نہ ہولناک دیواریں وہاں کونسا کویی سیاسی رہنما یا کاروباری بندہ رہتا تھا جس کی جان قیمتی ہوتی۔

قیمتی تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے کسی کو کوئی خطرہ ہو، جنہیں بوقت ضرورت مہرے کے طور پر استعمال کیا جا سکے جو ٹشو پیپر نہ بن سکیں وہ بھلا کس کام کے ؟۔

اس گھر میں تو ایک سادہ اللہ لوک سا لکھاری رہتا تھا جو بانوے سال کی عمر تک ریڈیو کے سکرپٹ لکھ کر اپنا خرچ چلاتا رہا۔

ہومیوپیتھک دوایئں بھی اسی رقم سے آتیں جو مفت بانٹی جاتیں ہر ضرورت مند میں بلکہ زبردستی دی جاتیں کہ مفتی جی ایلوپیتھک دواہوں کے سخت خلاف تھے۔

کہا کرتے، "تم لڑکیاں وٹامن کھا کھا کر خود کو مارتی ہو ان کے خطرناک اثرات جان لو تو آگ لگا دو گی تم ان تمام بوتلوں کو"

میر اذاتی خیال ھے اور اب تحقیق نے بھی ثابت کیا ہے کہ ایلوپیتھک دوایئں فایدہ کم اور نقصان زیادہ دیتی ہیں۔

مفتی جی کے لفظ 'کڑیو' کا دایرہ خاصا وسیع تھا۔ جس میں اٹھارہ سالہ شہابہ سے لے کر پروین عاطف سمیت ہر عمر کی 'کڑی' شامل تھی۔

میرا قلم بار بار بھٹکنے لگتا ھے اتنی یادیں ہیں کہ سوچ جانے کس کس کونے کھدرے میں گھومنے لگتی ھے اور کیا کیا نکال لاتی ہے، ذکر ہو رہا تھا مفتی جی کی بیٹھک کا۔

۔

فرش پر اوسط درجے کا فیروزی رنگ کا قالین۔ ایک جانب بھورے رنگ کا صوفہ ایک لیمپ، دوسری جانب بھی ایک پرنٹنڈ صوفہ جس کے قریب رکھے ریک پر سالوں پرانا یادگار گراموفون اور اس کے ساتھ ھی اوپر مفتی جی کے مجسمے کے چہرے کی تصویر جو مشہور مجسمہ ساز آذر زوبی نے بنایا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ کھڑکی کے قریب نمدے پر لکھنے کا ساز و سامان لیے اکثر سردی کی دھوپ میں مفتی جی بیٹھے نظر آتے۔ میں بھی بسا اوقات وہیں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی۔ مفتی جی تھک جاتے تو صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور میں سامنے کسی کرسی یا صوفے پر اٹک جاتی۔

ہماری بحث کا مرکز اکثر اللہ میاں یا پاکستان ہوتے۔ ان کا بڑا پن کہ مجھ جیسی ناسمجھ اور کج بحث کے الٹے سیدھے سوالات کو حوصلے سے سنتے اور میری ناقص عقل کے مطابق میری تشفی بھی کر دیتے۔

ایک بار بہت تنگ آ گیے کہ طبیعت کافی ناساز تھی تو صرف اتنا کہا، "کڑیے توں پاکستان دا ٹھیکہ لتا ہویا اے؟ بس اپنا کم ایمانداری نال کیتی جا۔ اوہ جانے تے اوہدا پاکستان" مراد اللہ میاں تھے۔

یہ الگ بات کہ شہاب صاحب اور وہ جب بھی مل بیٹھتے تو بات اکثر پاکستان ہی کی ہوتی۔ کبھی اچانک میں چلی جاتی تو دونوں ڈرائینگ روم میں ساتھ ساتھ بیٹھے کسی سنجیدہ گفتگو میں مصروف ہوتے۔ مجھے دیکھ کر موضوع بدل دیتے۔

میرے سامنے ہلکی پھلکی ادب یا پاکستان کے حوالے سے ہی بات چلتی۔ مجھے تجسس رہتا کہ وہ دونوں کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ کیفیت مفتی جی کی صرف اور صرف شہاب صاحب کے سامنے ہی ہوتی، وہ دونوں کیا باتیں کرتے تھے اتنی گھمبیرتا کے ساتھ؟ یہ عقدہ شہاب صاحب سے ملنے جلنے کے کچھ عرصہ بعد کسی نہ کسی حد تک کھل گیا تھا۔

شہاب صاحب کا لہجہ دھیما اور نرم ہوتا، سرگوشی نما، جبکہ مفتی جی اگرچہ عام طور پر اونچا بولتے تھے مگر شہاب صاحب کی موجودگی میں اپنی آواز کو متوازن رکھنے کی کوشش کرتے۔

میں نے کئی بار مفتی جی سے کہا کہ ایک کہانی آپ خود بھی ہیں۔ شہاب صاحب کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک چق تان رکھی ہی آپ نے اپنے سامنے کس سے اور کیوں چھپتے ہیں؟۔

چھت پر نظریں جمالیتے، عجیب گم سم سے لہجے مُیں کہتے، ''شہابہ نہ بوہتا سوچیا کرتے نہ بوہتیاں کہانیاں پایا کر
'' شہاب کی کھیڈ کج ہور ای یے ساڈ ییعقل توں باہر

شاید وہ سوچ اور کہانی کے زخم سے آشنا تھے۔ مجھے اس درد سے بچاپے رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسے درد تو نصیب سے ملتے ہیں بقول شاعر،

!یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

ان کی بات کا انداز اور لہجہ دبنگ ہوتا۔ خالص مشرقی پنجاب کے آہنگ مُیں بات کرتے۔ اردو تکلف سے مگر خوب بولتے۔ پنجابی میں انگریزی کا اعلی قسم کا تڑکہ لگاتے۔ قیام پاکستان سے پہلے انگریزی اور نفسیات میں ایم اے کر چکے تھے۔ دنیاوی اور روحانی علوم کے جانے کن کن صحرایوں کی خاک چھان چکے سو ان سے بحث کرنا یا ان موضوعات پر بات کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوںی کورا ان پڑھ کسی اصلی پی ایچ ڈی کے متھے لگے۔

بڑی بڑی روشن آنکھیں ان کی پوری ہستی کا احاطہ کرتیں۔ شعلے لپکتے بات کرتے ہوںے، خاص طور پر پاکستان کے حوالے سے کوںی بھی بات ہو ان کا لہجہ پرجوش ہو جاتا۔ کہا کرتے تھے،

''پاکستان کو کبھی گالی نہ دینا نسلیں برباد ھو جاںیں گی''

مفتی جی کی خواب گاہ بھی سادہ سی تھی۔ پرانی طرز کے دو درمیانے سے پلنگ، فرش پر بھورا قالین، پلنگوں کے سامنے ایک لکڑی کا ریک جس پر ٹُی وی دھرا ہوتا۔ ریک کے خانوں میں مفتی جی کی اشیاںے ضروریات اور ہومیوپیتھک دوایوں کا ڈھیر ہوتا تھا۔ پلنگ کی باںیں جانب کھڑکی اور ساتھ ویسا ہی صوفہ جیسا سفید پوش گھروں میں ہوتا ھے۔

صوفے اور کھڑکی کی جانب والا بیڈ مفتی جی کا تھا جس کے ساتھ تپائی پر شہاب صاحب کی چھوٹی سی تصویر اور کاغذات وغیرہ دھرے رہتے۔ یہ تصویر اب عکسی مفتی کے گھر مفتی جی کی مجسمے والی تصویر کے ساتھ ان کی لایبریری میں موجود ھے۔

صوفے پر بیٹھ کر دیکھیں تو پلنگ کے نیچے پان والی سفلچی نظر آتی جو مفتی جی دن میں ایک دوبار ضرور نکالتے۔ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ امی جی کی گھرکیوں کے باوجود مسکراتے ہویے اپنا پان لگاتے اور منہ میں ڈال لیتے۔

ان کی یہ حرکت اتنی معصوم اور بچگانہ انداز کی ہوتی کہ میں سوچتی اگر کویی اجنبی ایسے میں آجایے تو وہ کبھی یقین نہ کرے کہ ملگجے شلوار کرتے میں ملبوس فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھا شخص وہی ممتاز مفتی ہے جس کی تحریروں اور شخصیت نے ایک عالم پر سحر پھونک رکھا ھے۔

کیی بار میں نے سفلچی والی جگہ اور اس کے لوازمات کو صاف کر کے رکھا اور انہیں سمجھایا بھی کہ یہ پان کھانا اور بچوں کی طرح گند ڈالنا اچھی بات نہیں آپ کے پرستار کیا سوچیں گے؟ تو خاموشی سے مسکراتے ہویے پان چباتے مجھے دیکھتے رہتے۔

جیسے ہی میں سب ٹھیک کر کے رکھتی، وہ ایک شرارتی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلنگ سے اتر کر قالین پر آن بیٹھتے اور پان کی سفلچی پھر گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے سے نکال لیتے۔

''ایسے میں امی جی کہتیں، ''شہابہ مفتی جی سدھرنے والے نہیں میں نے ساری عمر کھپادی پر کویی فایدہ نہ ہوا

مٰیں سوچتی مفتی جی پر کونسی بات اثر کر سکتی ہے بھلا؟

شہاب صاحب سے شکایت کی جایے کہ سب ان کی اس عادت سے تنگ ہیں بلکہ ان کی اپنی صحت کو نقصان ہو تا ہے پان کھانے سے۔ان کی بات تو ٹالیں گے نہیں ! اور ہو سکتا ہے شہاب صاحب انہیں ہلکا ساڈانٹ بھی دیں کیونکہ ایک وہی تھے جن کے سامنے میں نے مفتی جی کو مودب اور خاموش دیکھا۔

میں اس تصور پر مسکرا اٹھی۔

‘‘مفتی جی کہنے لگے، ’’کی سوچ سوچ کے خوش ہو رہی ایں اینا

میں نے اپنی یہ سوچ من و عن مفتی جی کو بتادی تو وہ قلقاری (ان کی ہنسی بہت معصومانہ تھی اسی لیے میں نے قلقاری کا لفظ استعمال کیا) مار کر ہنس پڑے اور بہت محظوظ ہو یے۔

کہنے لگے، ’’یار شہابہ کبھی ایسا ہو اتو میں بہت لطف اٹھایوں گا۔ مگر چھپ کر اور صفایی سے پان کھانے پر مذاکرات ‘‘تو ہوں گے کچھ شرایط کچھ لین دین تو ھو گا شہاب اور اقبال بیگم سے

چودہ سال کے دوران میں نے امی جی کو سارا سارا دن پورے گھر اور کچن کے چکر لگاتے دیکھا۔ کیونکہ خاندان والوں، بیٹیوں کے سسرالیوں کی مہمان داری آسان کام نہ تھا اوپر سے مفتی جی کے ملاقاتی ! آنے والوں کے لیے چایے کا دور چلتا رہتا۔ موڈ ہو تا تو ساتھ والے پلنگ پر نیم دراز ہم سب کی باتوں کا لطف لینے کے ساتھ ساتھ لقمے بھی دیتی جاتیں۔ مفتی جی کی اور انکی دلچسپ چھیڑ چھاڑ کا میں خوب مزہ لیتی۔

امی جی کبھی کسی بات پر چڑ کر تھوڑا غصہ کرتیں تو مفتی جی ہنس کر ٹال جاتے۔

نشستیں طویل ہونے لگتیں تو امی جی ساتھ والے کمرے میں چلی جاتیں۔ مفتی جی کے چہرے پر ایسے میں بڑی شرارتی سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔امی جی اور مفتی جی دونوں کے لہجے تیز، کھرے اور بلند آہنگ تھے زندگی سے بھرپور !۔

امی جی سے مفتی جی کی تین بیٹیاں ہیں، سویرا، نیلوفر اور نقش۔ تینوں ہی کسی نہ کسی حوالے سے خاص۔ ایک بات سب میں مشترک ھے ملنساری محبت اور مفتی جی والا کھلاڈلا پن۔

تینوں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں جب میرا ان کے ہاں آنا جانا شروع ہوا۔ لیکن اکثر ان سے وہیں ملاقات رہتی۔

نقش اکثر وہاں ملتی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ تو ہنستی اور کہتی

شہابہ ہم تو تم سے جیلس ہو جاتے ہیں کبھی کبھی کہ ابو کی ڈایری میں تمہارا تو کیا تمہارے پڑوسیوں تک کا نمبر بھی ''موجود رہتا ھے کہ کسی موقع پر شہابہ نہ مس ہو جایے''

میری آنکھوں میں یہ سن کر خوشی کے آنسو آ گیے تھے یہ تو نصیب کی بات تھی۔ (اس وقت ابھی سیل فون پاکستان میں نہیں شروع ہوا تھا)

بیٹیوں کی آمد پر امی جی اور مفتی جی بہت خوش نظر آتے۔ گھر میں چھل پہل مزید بڑھ جاتی کہ مفتی جی کے احباب کی آمدورفت بھی اسی طرح جاری رہتی۔ بیٹیاں بھی سبھی سے بلا تکلف ملتیں، گپ شپ بھی ہوتی، قہقہے گونجتے، مفتی جی کے ڈھابے پر آن کر سبھی شانت سے ہو جاتے۔

سبھی ایک ہی مرکزے کا طواف کر رہے ہوتے اور وہ تھے مفتی جی!

جانے کہاں کہاں سے جذبے میں بھیگے لوگ، نوجوان لکھاری، ہم عصر اور مداح آیا کرتے۔ ایک جمگھٹا سا ہمہ وقت لگا رہتا۔ اسی کمرے اسی گھر میں منافقین مفتی جی کے گھٹنے چھو کر اپنا قد بڑھانے کی کوشش کرتے۔ ان کے ذریعے اپنے تعلقات بڑھاتے، ان کے پاس بیٹھ کر جی جی کرتے اور باہر جا کر شکوک پیدا کرتے رہے مفتی جی کی ذات کے بارے میں۔

میں ان منافقانہ رویوں پر حیران ھوتی۔ بہت سارے ادبی بت اسی زمانے میں پاش پاش ھونا شروع ہوگیے میری نظروں میں مگر مفتی جی سمجھاتے، "چھڈ ایناں نوں توں اپنا کم کیتی جا۔ اے رکاوٹاں نیں ساریاں دھیان ہٹان لیی، "راہ کھوٹی کرن لیی۔ توں اپنا دھیان بس اگے ول رکھ تے لنگھی جا

!مفتی جی کو سب نظر آتا تھا مگر ان کا حوصلہ، ان جیسا دل کہاں سے لاتا کویی

میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی لیکن کوشش کرتی کہ مفتی جی کی بات مان لوں۔ ان کی زندگی میں اور بہت عرصہ بعد تک بھی میں خاموش ہی رہی اپنے کام سے کام رکھا سب سے ملتی جلتی رہی۔

لیکن ایک واقعے نے میرے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے اور میں نے کھل کر ان منافقین، نااہل و بے حس ادبا و شعرا کی اصلیت کا پردہ چاک کیا، اپنی ذات کی خاطر نہیں ایک غریب شاعرہ کی خاطر، جو اس ادبی ٹولے کی مجرمانہ غفلت کی بھینٹ چڑھ گیی۔

یہ کہانی پھر سہی بلکہ سب جانتے ہیں۔

ان کے وصال کے بعد انہی لوگوں کو میں نے مفتی جی پر طنز کرتے بھی سنا۔ تبھی ابن الوقت قسم کے ان لوگوں سے دھیرے دھیرے دور ہوتی گیی۔ جن کا مقصد حیات ہمیشہ عہدے اور مراعات رہا۔

دیواریں بولتی ہیں

مفتی جی کی شریک حیات اقبال بیگم جنہیں میں امی جی کہتی تھی سادہ مگر خوش باش خاتون تھیں۔ زیادہ پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود خاصی عقلمند تھیں۔ مفتی جی کی زندگی اور مزاج کی رازداں ہونا آسان کام نہ تھا!

مفتی جی خود کہا کرتے، "میرے نال گزارا ہڑااو کھا اے اقبال نے نبھایا شاباش اے اینوں۔۔"

امی جی جھینپ کر ہنس پڑتیں۔

ان کے جانے کے بارہ سال بعد امی جی بھی چلی گیئں۔ ان کی زندگی میں دو چار بار میرا وہاں جانا ہوا۔ مگر مفتی جی کے بعد عجیب سی اداسی نے در و دیوار کو گھیر رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے کہ رہی ہوں،

"اب یہاں کویی نہیں رہتا۔ جس کے دم سے ساری رونقیں تھیں وہ تو گیا اب کسے ڈھونڈنے آیی ہو"؟

وہی کمرہ تھا وہی مانوس سا ماحول، نہیں تھا تو وہ مختصر سا وجود جو کمرے تو کیا پورے گھر پر چھایا رہتا تھا۔ جس نے ہر چیز کو اپنی جکڑ میں لے رکھا تھا۔ جو خود کو سمیٹنے کی کوشش میں نمایاں ہوتا گیا۔ مفتی جی کا سحر دلوں اور دماغوں پر کل بھی طاری تھا۔ آج بھی اسی طرح قایم ہے۔

اپنے افسانوں میں جس نرتکی کا وہ ذکر کرتے تھے، وہ نرتکی ان کے اپنے اندر ہی چھپی بیٹھی تھی سب کو لبھانے والی سب کو رجھانے والی!

ایک ایسا سیاہی چوس جو سب کے دکھ درد اپنے اندر جذب کر لیتا تھا۔ 'علی پور کا ایلی' پڑھنے والوں کی نظروں میں مفتی جی کا قد مزید بڑھتا گیا۔ وہ اتنے اونچے ہوتے گیے کہ سب ان کے سایے میں معدوم ہو گیے۔

کون اس طرح چوک میں اپنے گندے کپڑے دھوتا ھے؟ کون 'علی پور کا ایلی' بن کر خود کو کٹھرے میں کھڑا کرتا ہے؟ یہ حوصلہ اور ظرف عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ لوگ تو بد صورت چہروں پر چمک دار ماسک پہنے پھرتے ہیں۔ کوے ہوتے ہوے بھی مور کے مصنوعی پر۔ لگایے پھڑ پھڑ کرتے پھرتے ہیں؟

میں پھر بھٹک جاتی ہوں، مفتی جی کے نام کے ساتھ ہی یادوں کے جانے کون کون سے در کھل جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جانب پہلے بڑھوں؟ بات ہو رہی تھی امی جی کی!

امی جی کسی حد تک صاحب فراش ہو چکی تھیں۔ کافی دیر تک تو وہ مجھے نقش سمجھتی رہیں جو اس وقت کینیڈا میں تھی۔ یاد دلانے پر ماضی کے زینے اترنے لگیں میری موجودگی سے بے خبر!!

ماضی، حال، بے شمار چہروں اور ناموں کو گڈ مڈ کیے وہ یادوں کی پٹاری کھولے بیٹھی تھیں میرے آنسو چپ چاپ بہ رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ ان در و دیوار میں مفتی جی کی ہنسی سن رہی تھی، دونوں کی نوک جھونک، مفتی جی کی پاٹ دار آواز مجھے گھیر رہی تھی۔

مجھے وہ چلتے پھرتے محسوس ہو رہے تھے اپنے قریب ہی، انہیں ریک کے درازوں سے دوایں نکالتے دیکھ رہی تھی، سانس کی تکلیف میں کھانستے سن رہی تھی۔ پھر جانے باہر کویی برتن گرا ایک چھناکہ ہوا اور میں نے دیکھا میں اور امی جی اکیلی بیٹھی ہیں ایک دوسرے سے بے خبر!!

میں نے صوفے کی جانب دیکھا تو وہاں عکسی بیٹھے تھے، تہمینہ مسکرا رہی تھی کھڑی۔

نقش، سویرا، نیلو، بانو آپا اشفاق احمد، منشا یاد، پرتو روہیلہ، بلقیس محمود، مسعود مفتی، ابدال بیلا، سرفراز اقبال، پروین عاطف، احمد بشیر ان کی بیٹی نیلم بشیر اور جانے کتنے ہی چہرے سامنے سکرین بنی دیوار پر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ پھر اچانک ایک دھماکہ سا ہوا، امی جی دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں، میرے کان سن ہو گیے اور اس کے بعد ایک تکلیف دہ عمیق سناٹا!!

امی جی نقش سے مخاطب میری موجودگی کو جانے کب سے فراموش کر چکی تھیں۔

میں آنسو پونچھتے ہوے بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے نکل آیی۔ اس کے بعد وہاں جانے کی ہمت نہ ہویی۔ ان کی وفادار عسکری اب بھی ان کے ساتھ تھی، وہیں جہاں ایک انمول ہستی کی بہت ساری قیمتی یادیں قدم قدم پر بکھری پڑی تھیں۔

جہاں سے جانے کس کس نے دوایے درد پایی اور کون کون درد دے گیا؟

ابھی کچھ دن پہلے میں اس جگہ کے سامنے بہت دیر کھڑی رہی، وقت کتنا ظالم ہے؟ نہ وہ گھر رہا نہ اس کی وہ شکل۔ خریدار نے اس کی شکل وصورت ہی بدل ڈالی ہے۔ میں تصور ہی میں سارا نقشہ دیکھتی رہی اور بوجھل دل کے ساتھ واپس آگیی۔

وہ گونگے بہرے در و دیوار زمیں بوس ہو چکے تھے جو اگر زبان رکھتے تو جانے دنیا کو کیا کیا بتاتے اس انسان کے بارے مٰیں جو اتنے عظیم تھے کہ ان کا عہد اس عہد کے لوگ ان کی عظمت کو نہ جان پایے۔ شایید ان کے پاس وہ پیمانہ ہی نہ تھا جو مفتی جی کی ذات کو پوری طرح جانچ سکتا۔

شایید یہی ہر اس انسان کا نصیب ہوتا ھے جو اپنے وقت سے آگے چلتا ھے۔ وہ اپنے باہر کی دنیا میں اکیلا رہ جاتا ھے ذہنی اور جذباتی طور پر۔ مفتی جی ویسے بھی کسی اور دنیا کے باسی تھے، عقل و خرد سے کہیں آگے کی دنیا، جہاں روح کا راج تھا، جہاں صرف من کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جہاں کسی اور 'ہستی' کی سرگوشیاں سنایی دیتی ہیں

عسکری اور ویسپا

! ریت کی طرح کچھ وقت ھاتھوں سے پھسل گیا

امی جی بھی مفتی جی کے پاس چلی گییں۔

اوپر والے حصے میں جہاں عکسی اور تہمینہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہتے تھے کچھ عرصہ وہاں عکسی اور حنا، حنا کی لے پالک بچی کے ساتھ قیام پذیر تھے۔

ان دنوں میں ھندوستان کی پنجابی کی نامور لیکھک اجیت کور کی سارک اپیکس باڈی کے لیے چیف کو آرڈینیٹر کے طور پر پاکستان سے سارک ممالک کی ادبی و ثقافتی اور صوفی کانفرنس کے لیے ادیبوں اور صوفی گلوکاروں کے وفود ھندوستان اور سارک ممالک میں لے جاتی تھی۔ مقصد پاکستانی ثقافت اور ادب کو متعارف کروانا اور ادب و ثقافت کے زریعے امن کی کوشش تھا۔

بظاہر تو یہ سب بھلا لگتا تھا لیکن اندر کی سیاست کیا تھی علم نہیں؟۔ کچھ عرصے بعد میں نے جانا چھوڑ دیا۔

اس کے بعد بھلا ہو مودی سرکار کا جس نے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو بھی چایے خانے کا فرش سمجھ کر امن و آشتی کے لیے سبھی کی کرایی محنت پر جھاڑو پھیر دی۔

آگرہ میں ہونے والی ایک کانفرنس میں عکسی بھی میرے ساتھ تھے کہ عکسی بین الاقوامی سطح پر ثقافت کے حوالے سے ایک بہت بڑا نام ہیں۔ پاکستان کیا دنیا بھر کی ثقافت کے بارے جتنا وہ جانتے ہیں شاید ہی کویی جانتا ہو۔

دوبارہؔ عکسی سے باقاعدہ رابطہ شروع ہوا۔

اس دوران حنا کی جگہ سحر مفتی نے لے لی۔ اللہ کرے اس سحر کی کبھی شام نہ ہو۔

عکسی نے مفتی جی کے وصال کے بعد کتابیں لکھنا شروع کیں۔ پہلے وہ مفتی جی کے کہنے پر بھی نہیں لکھتے تھے۔

کہتے تھے، ''میری مجال میں یہ گستاخی کروں آدب کے ہر کولیس کے ہوتے ہوئے۔ ایک ہی گھر میں ممتاز مفتی جیسے ادبی جن کے سامنے میری تحریروں کی کیا اوقات''؟ بہت سیانے نکلے عکسی مفتی۔

مفتی جی کو لکھنے کا جنون تھا بلکہ لکھنا ان کا عشق، ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ان کا بس چلتا تو ساری دنیا کو لکھنے کے کام پر لگا دیتے کاغذ پنسل پکڑا کر۔

بس 'لکھو لکھو' کی رٹ لگائے رکھتے۔ جس میں بھی لکھنے کا ذرا سا بھی شوق یا ہنر دیکھتے اس کے پیچھے پڑ جاتے حتیٰ کہ وہ لکھنے لگتا یا میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ مفتی جی تو دم نہ لینے دیتے تھے۔ کئی اناڑیوں کی سانس پھولنے لگتی۔ خلوص کے ساتھ عبادت سمجھ کر لکھنا مذاق تھوڑا ہی ہے؟ تن من کے سارے بلب جلانے پڑتے ہیں، جوگ لینا پڑتا ہے، الفاظ خراج مانگتے ہیں لہو کا جذبوں کا!

الفاظ کی توقیر ہوتی ہے، ان کی شکلیں ہوتی ہیں اچھی یا بری، اثر ہوتا ہے منفی یا مثبت، لکھنے والے کی ذات کا اصل پرتو بننے والے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے ورنہ نمایش نری، وقتی چمک، بہلاوے اور پھر ٹھس!

سچے الفاظ دھیرے دھیرے دل میں گھر کرتے ہیں، قلبی ماہیت بدل دیتے ہیں۔ ان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔ لفظوں سے سچی محبت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بھاڑے کے الفاظ کیا اثر کریں گے؟ ٹرانسمیٹر اور ریسیور دونوں کا ایک ویو لینگتھ پر ہونا ضروری ہوتا ہے۔

مفتی جی نے الفاظ سے عشق کو نبھایا۔ حلقہ ارباب ذوق، 'رابطہ' اور 'چھڈ یار' جیسی تنظیمیں بنائیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے احباب کو لکھنے پر آمادہ کرتے رہے۔

ہمارے بہت سارے سینیر اور ہم عصر لکھاری جو قلم سے وابستہ رہے یا آج بھی لکھ رہے ہیں، ان کے جذبوں کو جوان رکھنے میں مفتی جی اور منشا یاد کا بہت ہاتھ ہے۔

۔ مفتی جی کے گھرانے کا ہر فرد اپنی جگہ کسی انوکھی کہانی کا کردار لگتا۔ ان کے ملنے جلنے والے بھی منفرد اور نرالے سے لوگ، تبھی تو 'اوکھے لوگ'، اور اوکھے لوگ' اور 'اوکھے اولڑے' جسی کتابیں ان کے قلم سے وجود میں آییں ! ۔ مفتی جی کے گرد لگی بھیڑ میں کیی مستقل کردار بھی تھے، ان میں ایک تھی عسکری

عسکری درمیانی عمر کی گوری چٹی پوٹھواری لب ولہجے والی ہنس مکھ سی خاتون تھی جو عرصہ دراز سے مفتی گھرانے کی خدمت کر رہی تھی بلکہ خدمت کرواتی بھی تھی۔ وہ سب کی لاڈلی منہ چڑھی خدمت گزار جسے جب چاہے ڈانٹ بھی دیتی پر کویی برا نہ مناتا۔

ویسے تو سارے گھر کو سنبھالتی، جی نہ چاہتا تو صاف انکار بھی کر دیتی کام سے۔ اس کی وفاداری کے باعث اسے بہت سارے اختیارات حاصل تھے گھرانے کے افراد کی طرح۔ امی جی کے ساتھ مل کر مفتی جی کے مہمانوں کے لیے چایے وغیرہ کا انتظام بھی کرتی اور ساتھ ساتھ فرمایشوں کی لسٹ بھی بناتی جاتی۔

مجھے بہت پیار کرتی تھی، جب بھی میں جاتی بطور خاص چایے بنا کر دیتی بلکہ کھانے کا بھی پوچھتی۔ اکثر مفتی جی کے کمرے میں بیٹھی ٹانگیں جھلاتے، مسکراتے ہویے سب کی باتیں سنتی رہتی۔

''مفتی جی اسے چھیڑتے، ''عسکری تینوں کی سمجھ لگدی اے اینہاں گلاں دی؟

وہ تڑسے جواب دیتی ''کیوں نییں سمجھ لگنی مفتی جی تساں میکی جاہل سمجھنے او'' اور بھڑوں کے چھتے سے ہاتھ چھو جاتا جیسے۔ بولتی جاتی جانے کیا کیا؟

آخر مفتی جی ہاتھ جوڑ دیتے۔ ''نہ نہ میری مجال توں تے میری وی استاد ایں اے سارے تیرے توں سکھن آندے ''نیں میں تے اینویں وچ ریلو کٹا

" توشان بے نیازی سے کہتی، "اج تاں میں جلی آں فیر میکی آخسوتے گل نہ کرساں کدے

ہم سب ہنس پڑتے

موڈ ہوتا تو ہنسی میں ساتھ دیتی ورنہ منہ بنا کر نکل جاتی۔ مفتی جی کہتے،

"اب دو دن چایے کی چھٹی سمجھو "

اس ڈر سے کہ مفتی جی اور امی جی کو واقعی کچن کے کام کا مسلہ نہ بن جایے، ہم میں سے کویی جاتا اور اسے مناتا۔

عسکری کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ جب مفتی جی صحت مند تھے اور اپنا ویسپا سکوٹر چلاتے تھے تو ایک دوبار ایمرجنسی میں خود اسی سکوٹر پر اسے ہسپتال لے گیے تھے۔

عسکری نے اس واقعہ کو میڈل بنا کر، اپنے ماتھے پر سجا رکھا تھا۔ وہ یہ قصہ ہر نیے ملاقاتی کو سنانے کی کوشش ضرور کرتی۔ کتنی معصوم سی خوشی تھی اس کی!

تھی سخت موڈی، بگڑتی تو سمجھانا مشکل ہو جاتا۔ یہ بھی اس کے مان کا اپنایت کا ایک انداز تھا! مفتی جی کے گھرانے نے اسے پیار ہی اتنا دیا تھا کہ وہ اب ایک 'سپایلڈ چایلڈ' بن چکی تھی بقول مفتی جی۔

عسکری کا موڈ نہ ہوتا تو منہ پھاڑ کر چایے بنانے سے انکار کر دیتی،

" اب کیتلی نہیں چڑھے گی کہ دیا میں نے مفتی جی"۔ یہ اس کا مخصوص جملہ تھا جسے وہ وقتاً فوقتاً ہتھار کے طور پر استعمال کرتی۔

مفتی جی مسکرا کر درخواست کرتے کہ دیکھ تجھے دعاییں ملتی ہیں چایے پلانے سے، تو ہاتھ لہرا کر اپنے مخصوص لہجے میں کہتی کہ یہ لکھنے والے کسی کو دعا نہیں دے سکتے۔ اور یہ کہ کر کچن میں چلی جاتی کیتلی چڑھانے!!

عسکری مفتی خاندان کی عقیدت میں لتھڑی ہوئی تھی کہ بے اماں گھڑیوں میں یہ گھر اس کے لیے جائے اماں بنا تھا
۔

مفتی جی یا امی جی کو ذرا تکلیف ہوتی تو عسکری رونے لگتی۔ اس کی آنکھیں لال ہو جاتیں جن کا اصل رنگ مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کچھ بھورا کچھ نیلا ملا جلا سا رنگ تھا اس کی آنکھوں کا جو موڈ کے حساب سے بدلتا رہتا۔

ایک بار میں نے چھیڑ دیا عسکری کو آنکھوں کے رنگ بارے۔

''مفتی جی نے بھی شرارت سے کہدیا، ''عسکری کی آنکھوں کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلتا ھے

! بس پھر اللہ دے اور بندہ لے

! عسکری سے ہم دونوں کو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا پڑی تب کہیں جا کر جان چھوٹی۔ امی جی سے ڈانٹ الگ

مفتی جی کے بارے میں لکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے ہر بار میرے لیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں؟

لکھنے بیٹھتی ہوں تو یادوں کی بھول بھلیوں میں بس ایک ڈور کے سہارے کھو جاتی ہوں، کبھی ایک سرا ہاتھ آجاتا !! ہے تو کبھی دوسرا

مفتی جی کے اس ویسپا کی بھی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ آخر اتنے بڑے لکھاری کا ویسپا تھا، بلکہ ہے۔ عرصہ دراز یہ بے چارہ لان کے کونے میں کھڑا موسموں کے بدلتے تیور دیکھتا اور سہتا رہا۔ مفتی جی کی بیماری کے باعث یہ بھی ایک جانب منہ لٹکائے کھڑا رہا۔

مفتی جی کے وصال کے بعد یتیم ہو گیا۔ امی جی نے ایک لکڑی کے کام والے کے بار بار اصرار پر بہت ہی کم قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔

عکسی نے بڑی کھوج کے بعد وہ سکوٹر کہیں سے بر آمد کر لیا۔ اسے ل یہی پالش لگایی اور ٹھوک بجا کر، لشکا مشکا کر اپنے گھر رکھ لیا ھے۔

کہتے ہیں اسے دیکھ کر مفتی جی کی یادیں تازہ ھو جاتی ہیں۔

مفتی جی کی یادیں کہاں اور کب نہیں تازہ ہو تیں؟

جانے عکسی مفتی کے کتنے آنسو کتنی مسکراہٹیں اس ویسپا سے وابستہ ہوں گی،

!وہ بتاتے تھوڑا ہی ہیں

جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہویی مفتی جی اپنا سکوٹر چلانے سے قاصر تھے۔ مگر اسے روز دیکھتے ضرور تھے۔ بار ہاڈرایینگ روم میں بیٹھے وہ اس کی صفایی ستھرایی کی ہدایات جاری کیا کرتے۔

جسمانی طور پر بظاہر لاغر، اردو ادب کے وہ عظیم ادیب ذہنی طور پر انتہایی توانا تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی انہیں بغیر عینک کے لکھتا دیکھ کر۔ ہاں البتہ ان کے لکھے ہویے سکرپٹ اور دوسری تحریریں بڑے بڑے خوبصورت صاف ستھرے حروف میں فیکس یا کمپیوٹر کے استعمال شدہ جہازی سایز کے رولز کی الٹی جانب لکھے ہوتے تھے۔

کیونکہ نہ تو وہ سرمایہ دار تھے نہ سرکاری ادیب اور نہ ہی کسی 'درآمد شدہ ازم' کے پرچاری سو نہ ان کے کویی جشن منایے جاتے ہیں ل یہ دن۔ کسی ادبی ادارے کا کویی گوشہ تک ان کے نام نہیں۔ ہے نا عجیب سی بات؟

! کویی بغض یا پھر کویی مخفی ہدایات کہیں سے؟ اللہ کی اللہ ہی جانے

ان کا ایجنڈا صرف ادب اور پاکستان تھا۔ کسی باہر والے کا مفاد نہیں وابستہ تھا ان سے۔

! کسی کے کام کے نہ تھے وہ

محض پاکستان کی محبت میں لت پت ہونا یا ادب کی بے لوث خدمت کرنا تو ضروری نہیں نا۔ کیا ہوا جو انہوں نے اردو ادب کو شہکار کتابیں اور ناول دیے؟ انہیں دنیاوی انداز میں سرمایہ کاری کرنی نہ آیی۔ آج زندہ ہوتے تو پوچھتی ان سے

کیا ادب میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

(اقبال کی روح سے مٙعذرت کے ساتھ)

سو کون فنڈ دیتا کون سپانسر کرتا بڑے بڑے لاکھوں کے سرمایے سے برپا کیے جانے والے جشن؟

میرے بارہا شور مچانے پر بھی ان کے اور قدرت اللہ شہاب کے نام پر ایک سڑک تک نہ کی گیی؟ جبکہ ایسے افراد کے ناموں پر بھی سڑکیں ہیں جنہیں ذاتی مراسم و پسند کی بنا پر ادیب و شاعر بنایا گیا اور ان کے نام پر اسلام آباد اور دوسرے شہروں میں شاہراہات ہیں۔

ہماری ملکی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے لیے تو خیر ڈوریں ہلایی ہی کہیں اور سے جاتی ہیں۔ لیکن اگر ادبی اور ثقافتی فضا کے رنگ کا ڈھنگ اور اس میں بھنگ بھی کویی اور ہاتھ ملاتے ہیں تو حال وہی ہونا ہے جو ہو رہا ھے۔

حکومتی سطح پر ادبی اداروں اور وزارتوں کے یہ پر اسرار فیصلے مجھ ناسمجھ کی عقل سے باہر ہیں۔

میرے ان سولات کے جوابات کسی ادارے کے پاس ہیں نہ کسی میڈیا اور سوشل میڈیا گروپ کے پاس۔

یہ ریڈیو آذاد کشمیر ہے

میں نے ۱۹۸۶میں ان پر ایک خاکہ لکھاجو نوائے وقت میں چھپاتھا۔اخبار آیامجھے مفتی جی کے رد عمل کاانتظار تھا۔

دوپہر میں فون بجابے تابی سے اٹھایا، دوسری جانب منشایاد تھے۔

چھوٹتے ہی کہنے لگے، "یہ تم نے کیالکھاھے شہابہ ؟اتنے بڑے ادیب کے بارے میں اور کس انداز مٰیں؟ وہ یہ " کہتاھے،وہ یہ کرتاہے وہ ہنستاہے وہ بولتاھے۔ایسے لکھتے ہیں بڑوں کے بارے میں ؟وغیرہ وغیرہ

میں تھوڑاگھبر اگیی کہ واقعی کچھ گڑبڑھوگیی ھے۔اگر مفتی جی ناراض ھوگیے تو؟

عجیب الجھن کاشکار تھی۔فون کی گھنٹی بجتی توبھاگتی مگر کسی اور کی آواز سن کر مایوس ہوجاتی۔مجھے لگامفتی جی ناراض ہوگیے ہیں۔منشایاد کی بات درست لگنے لگی۔مجھے یہ خاکہ پہلے انہیں دکھادیناچاہیے تھا۔مگر اب کیاہوسکتا تھاجو ہوناتھاوہ توہوچکا۔میں خاصی پریشان تھی اور سوچ میں تھی کہ کس طریقے سے مفتی جی کومنایاجاسکتاہے۔

شام ہوگیی۔

ایک کال آیی میں نے بے دلی سے اٹھایی۔مفتی جی کی آواز سن کر میں مزید گھبر اگیی کہ جانے کیاکہیں گے کتنا ناراض ہوں گے کیاہوں گی؟

ایک زوردار قلقاری سنی میں نے اور مفتی جی کہ رہے تھے،

"قسمے اج تک کسے نے میرے اتے اپنے پیار نال کجھ نیں لکھیا کڑیے کمال کر چھڈیااے توں شہابہؑ "

" میں نے حیرت سے پوچھا،"آپ ناراض تونہیں ناں؟

مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

"کہنے لگے، "ناراض کہڑی گلوں؟ میں تے بڑا خوش آں اج

میرا جی چاہا میں خوشی سے چلایوں اونچا اونچا ہر جانب، سب کو بتاہوں کہ دیکھو مفتی جی نے کیا کہا ہے میری تحریر کے بارے میں، کتنا پسند کیا ہے انہوں نے میری بے وقوفانہ سی کوشش کو۔

اس خاکے کا عنوان تھا 'اسی سالہ بچہ ممتاز مفتی' جو روزنامہ نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن میں چھپا تھا۔

ہے کسی کا اتنا بڑا دل؟

بونے اپنے قد کو بڑھانے کی خاطر کیا کیا جتن کرتے ھیں اور وہ ادب کے بلند قامت دیو مجھ جیسی چھوٹی سی ہستی کو اتنا مان دے رہے تھے۔

مفتی جی کہاں ہیں اب آپ جیسے انسان؟

پاکستان اور قدرت اللہ شہاب کے بعد ان کا بڑا عشق ہومیوپیتھی تھا۔ڈاکٹر اشفاق حسین کے ہمراہ ہندوستان بھی گیے۔ وہاں سے ہومیوپیتھی کی ڈھیروں نایاب کتابیں اٹھالایے۔ اس سفر کی داستان ان کی کتاب 'ہندیاترا' میں موجود ھے۔

یہ باتیں ان سے ملنے سے بہت پہلے کی ہیں جو وہ سنایا کرتے تھے مجھے جب کبھی موڈ میں ہوتے۔ اپنے سر پر سفید گھنے بالوں کے ٹوکرے اور آخری عمر تک عینک کے بغیر نظر کو اسی ہومیوپیتھی کا کمال گردانتے تھے۔

میرا پہلا بیٹا پیدا ہونے والا تھا تو ماں کی طرح مجھے سمجھاتے کہ ڈاکٹر کی بتایی وٹامن ہرگز نہ کھانا۔ اپنی بنایی ہویی ہومیو گولیاں دیتے یا کسی دوا کا نام بتا دیتے۔ میرا ایمان تھا ان کے مشوروں پر، سو بیٹوں کے دانت نکلنے کی عمر میں بھی انہوں نے ایک ہومیوپیتھک دوا 'باییو پلاسجن' کے استعمال کی ہدایت کی۔

واقعی میرے بچوں کا وہ دور کسی روں روں اور مسایل کے بغیر باآسانی گزر گیا۔ آجکل اچھے ایلوپیتھک ڈاکٹر بھی وہی دوا بچوں کے لیے تجویز کرتے ہیں۔

بچوں کو بخار ہوتا پیٹ خراب ہوتا تو مفتی جی کو فون کرتی وہ دوا بتادیتے۔

"کہتے، "کتھے کھجل ہوییں گی میرے کولوں گولیاں لے جاٗ

!! مفتی جی کہاں کہاں یاد کروں گی آپ کو؟ مگر آپ بھولیں بھی تو نا

یہ چھوٹی چھوٹی گولیاں اور پڑیاں وہ اپنے لکھے ہوے سکر یپٹس کی کمایی سے خریدتے اور مفت بانٹتے رہے آخر دم تک۔ انہوں نے آخری سانس تک روحانی، ذہنی اور جسمانی دوا دارو کیا ہر اس شخص کا جو بھی ان کے قریب آیا یا کویی مشورہ مانگا۔

نفسیاتی معالج رہے تھے سو اپنے پاس آنے والی خواتین کی ٗعزت نفس کی بحالی کا کام بڑے غیر محسوس انداز میں سر انجام دیتے۔ بے دھڑک تعریفی جملے ادا کرتے۔

'' اکثر 'سہیلیوں' کو کہتے "کڑیے اج تے بڑے لشکارے مار ریی ایں

کالے من والے بالشتیے باہر محفلوں میں انہیں عجیب عجیب القابات سے نوازتے۔ ان کی پرستاروں کو ہتک آمیز انداز میں 'مفتی کی گوپیاں' کہتے۔ مفتی جی چھوٹے دماغوں کی چھوٹی سوچ کو ہنس کر ٹال دیتے کہتے،

''انہیں اپنا کام کرنے دو ہم اپنا کام کرتے ہیں اپنا اپنا نصیب اور اوقات ھے اللہ جس کے ذمے جو کام لگادے۔ ''

میں حیرت سے ان کے منحنی سے وجود کو دیکھتی جسکے سینے میں سمندر جیسا دل موجود تھا منافقوں والی 'گولیاں' انہیں نہیں دینی آتی تھیں۔ وہ روحانی اور جسمانی صحت کے لیے دوا دینے کے عادی تھے۔

ان کے پاس حالات کی ستایی، شہرت کی شوقین، شاطر ادیبوں شاعروں کی ڈسی ہویی ہر عمر ہر حلیے کی لڑکیاں اور خواتین بلا جھجک آ جاتیں کہ یہاں کویی استحصالی بیٹھا تھا نہ کویی گدھ !!

مفتی جی کا بے ضرر وجود جانے کس کس کے رازوں کا امین تھا؟ وہ سب کی بات بہت توجہ و خلوص کے ساتھ سنتے اور بہترین مشورے دیتے۔ دنیا جہاں سے خط آتے عقیدت میں بھیگے ہویے، مسایل سے بھرے ہویے، مشوروں کے لیے جھولیاں پھیلایے!

۔انتہایی تھکاوٹ اور بیماری میں بھی تکیہ لگایے بیٹھے ان خطوط کے جواب لکھ رہے ہوتے۔

بھلا کویی پوچھے مفتی جی آپ کو کیا ملتا تھا اس ساری مغزماری سے ؟

! شاید انہیں چسکہ تھا خدمت کا، لوگوں کے دکھ بانٹنے کا، دوست بن کر حاصلہ دینے کا

شروع شروع میں استاد بھی رہے کچھ عرصہ پڑھانے کا کام کیا۔ آزادی کے بعد اشفاق احمد کے ساتھ مہاجر کیمپوں میں ھندوستان سے آنے والے لٹے پٹے لوگوں کے نفسیاتی علاج کا کام سنبھالا۔ جانے ان لٹے پٹے اجڑے لوگوں میں کیا کیا دیکھا اور برداشت کیا کہ پاکستان کو برا کہنے والوں کو ہمیشہ سختی سے منع کیا کہ ایسا مت کرو تم نہیں جانتے کہ کتنا بڑا گناہ کر رہے ہو۔ پاکستان کو برا کہنے کی بہت بڑی سزا ھے۔

بعد میں آزاد کشمیر ریڈیو کی ملازمت کی۔ انڈیا کی سرحد کے قریب بھوسے کے ایک ٹرک میں ابتدایی ٹرانسمشن کا سیٹ لگا کر "یہ ریڈیو آزاد کشمیر ہے" کی پہلی آواز کسی اور کی نہیں انہی عظیم لکھاری اور انسان کی تھی جنہیں دنیا ممتاز مفتی کے نام سے جانتی ھے۔

مفتی جی نے جب یہ قصہ مجھے سنایا تو ان کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے، جس کی تپش میں آج بھی اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔

شاید اسی آگ کی ایک چنگاری وہ میرے من میں بھی سلگتی چھوڑ گیے۔

پاکستان اور کشمیر کے لیے ان کی محبت اتنی شدید تھی کہ وہ اسے چھپا نہیں پاتے تھے۔ 'عالم جہاد ٹرک' اور ریڈیو آزاد کشمیر کی روداد جذبوں کی سچایی کی ایک داستان ہے جسے ہر پاکستانی اور کشمیری تک پہنچنا چاہیے۔

قصہ ہے یہ ۱۹۵۰ کا مفتی جی تب مری میں تھے۔ سری نگر سے روزانہ پاکستان کے خلاف زہر بھرے پروگرام نشر ہوتے۔ اس پراپیگنڈے کا منہ توڑ جواب تو دینا تھا۔ سو ریڈیو آزاد کشمیر نے یہ بیڑا اٹھایا، ایک پرانی بوسیدہ سی عمارت میں قایم اس ننھے منے ریڈیو سٹیشن کے پاس انتنہایی محدود وسایل تھے۔

مگر حوصلے جواں اور تازہ تھے۔

عماد الدین اپنے وقت کے ایک بہت قابل، پاکستان و کشمیر کی محبت میں گوڈے گوڈے دھنسے انجینیر اس ریڈیو سٹیشن کو چلا رہے تھے بلکہ بغیر پہیوں کے دھکیل رہے تھے۔ ان کے ساتھ حب الوطنی کے جذبوں سے سرشار، ریڈیو کے کچھ نامور فنکار بھی شامل تھے۔ جن میں محمد حسین، نور اور تاج نمایاں تھے۔

!کاش ہم نے اپنے ان ہیروز کو بھی یاد رکھا ہوتا فلمی ھیروز کی طرح

مفتی جی اور اشفاق احمد کے ذمے سکرپٹ لکھنا تھا۔

اس ٹیم کو روزانہ سری نگر سٹیشن کے پاکستان مخالف پراپیگنڈہ کا بھرپور اور موثر جواب دینا ہوتا تھا۔ سو ایک پروگرام ترتیب دیا گیا 'ڈھول کا پول'۔ روز کے روز سری نگر ریڈیو کی ٹرانسمشن سن کر جلدی جلدی سکرپٹ لکھا جاتا اور صداکار پرجوش انداز میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا کرتے۔ ایسی ایمرجنسی میں اتنے حساس جوابی

سکرپٹ لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ شاید وہ وقت اور وہ کام قدرت کی جانب سے ان دونوں نامور لکھاریوں کا ٹریننگ گراونڈ بنا۔

سکرپٹ لکھنے میں مہارت اسی دور میں حاصل ہوئی۔

مفتی جی کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ڈرامہ محمد حسین سے سیکھا جنہیں وہ بہت بڑا فنکار مانتے تھے۔ حیرت ہوتی ھے کہ بے سروسامانی کے عالم میں ایک خستہ عمارت اور ایک ٹرک کے ساتھ چند افراد پاکستان کے مخالفوں کو کیسا منہ توڑ جواب دیا کرتے تھے۔

کیا جذبہ تھا کیسے زندہ لوگ تھے !!؟

!! آج سب کچھ ھے مگر شاید بے روح اور کھوکھلا

وہ جذبہ وہ روح کم لوگوں میں نظر آتی ہے اب۔ یا ہم فطری طور پر مشکلات کے علاوہ اپنے جوہر دکھانے سے معذور ہوتے ہیں؟

اسی دور میں ایک اور تاریخی کارنامہ سرانجام دیا اس ٹیم نے۔

مشہور زمانہ نغمہ ''وطن ہمارا آزاد کشمیر'' ہم بچپن سے سنتے آیے ہیں لیکن اس کی تاریخ سے عشر عشیر بھی واقف نہیں۔ ہمیں مغربی 'مفکرین' اور ان کے وظیفہ خوار میڈیا سے فرصت ملے تو ہم اپنی قوم کو بتائیں کہ قومیں کیسے بنتی ہیں؟' پاکستان کے لیے کس نے کیا کام کیا؟ پاکستان اور کشمیر کا کیا تعلق ہے؟ کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کیوں کہا تھا قاید اعظم نے؟

خیر جو دلچسپ کہانی میں نے سنی اس نغمے کی آپ کو بھی سناتی ہوں۔

!جو مفتی جی نے ایک بار سنائی اور بھیگی پلکوں کے ساتھ عکسی مفتی نے دہرائی

یہ مقبول نغمہ مشہور شاعر یوسف ظفر کی تخلیق تھی۔

جوش وجذبے کی بدولت نغمہ تو لکھا گیا، اس کے بعد مرحلہ درپیش تھا ریکارڈنگ کا۔ کیونکہ اس زمانے میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ صرف لاہور ریڈیو سٹیشن پر ایک ریکارڈنگ مشین تھی وہ بھی پرانی سی گھسی پٹی، گھومنے والی ایسی مشکل قسم کی مشین جس کے بارے میں ہم شاید اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

ہم تو ننھے منے سیل فون سے ریکارڈنگ کر لیتے ہیں جہاں چاہیں جب چاہیں۔ اس زمانے میں ایک نیے معاشی طور پر لٹے پٹے ملک میں کام کسطرح ہوتے تھے، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔

مفتی جی اور عکسی اس نغمے کی ریکارڈنگ کے لیے مری سے لاہور پہنچے۔ یہ آج کے موٹروے یا جی ٹی روڈ والا سفر نہ تھا۔ صحیح معنوں میں انگریزی والا 'سفر' تھا۔ سنا ہے اس دور میں اتنے لمبے سفر کا تصور ہی بخار چڑھا دیتا تھا۔

اس وقت کی ایک مقبول گلوکارہ انیقہ بانو کی آواز میں وہ نغمہ ریکارڈ ہوا۔ نغمے کا بڑا سا توے جیسا گھومنے والا ریکارڈ لے کر

لاہور سے پنڈی تک کا سفر ایک بس میں طے ہوا۔

اس زمانے کی بس مٰیں کوئلے والا انجن ہوا کرتا تھا، بس کے پچھلے حصے کو کھول کر اس میں کوئلے ڈالے جاتے، بس دھواں دیتی اور با آواز بلند ہانپتی کانپتی چلتی۔ عکسی مفتی تو رونے والے ہو گیے تھے اس تھکا دینے والے سفر سے کہ ان کا واحد رشتہ مفتی جی تھے اور جہاں جاتے دونوں اکٹھے جاتے۔۔ لیکن اس سفر کے دوران پہلی بار سر سبز پہاڑ دیکھ کر خوشگوار حیرت کے باعث بس کے سفر کی کوفت جاتی رہی۔

مفتی جی جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ان کے چہرے پر ایسی نرمی اور چمک تھی جو بہار کے پہلے پہلے جھونکوں میں محسوس ہوتی ہے۔ جانے کیا کیا کچھ یاد آیا ہو گا انہیں؟ جانے کیسی کیسی دھوپ چھاؤں نے یادوں کے آنگن میں آنچل لہرایے ہوں گے؟

اس دن مجھے پاکستان اور کشمیر سے ان کی بے تحاشہ محبت کا اندازہ ہوا۔

سچا تخلیق کار ہو نہی نہیں بن جاتا ایک دن میں۔ کندن بننے کے لیے وقت اور حالات کی تپتی بھٹی میں جلنا اور سلگنا پڑتا ھے، تب کہیں جا کر دکھاوے کی پرتیں جلنے کے بعد اصل سونا سامنے آتا ہے!

مفتی جی کچھ عرصہ کراچی میں بھی رہے۔ جہاں انہیں بابوں نے زبردستی بھیجا تھا۔ کام تو حفیظ جالندھری کی ماتحتی میں کیا مگر اصل مقصد شہاب صاحب سے ملاقات تھی۔ مفتی جی کی شخصیت کا یہ پہلو ایسا ہے جس کو میں نے خود آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے کسی حد تک۔ اگرچہ انہوں نے کبھی مانا نہیں اپنے روحانی پہلو کو، ہمیشہ انکار ہی کرتے رہے۔

اس سے پہلے پنڈی میں بابوں کے پاس حاضریوں کے ساتھ ساتھ ان سے بھاگنے اور ان کی نفی کرنے کا سلسلہ بھی شروّع ہو چکا تھا۔ کراچی قیام کے دوران شہاب صاحب سے مفتی جی کا رابطہ ہوا اور دھیرے دھیرے مظبوط ہوتا گیا۔

دارلخلافہ اسلام آباد منتقل ہوا۔ شہاب صاحب صدر ایوب کے سول سیکرٹری مقرر ہویے۔ شہاب صاحب نے انہیں اپنے ساتھ او ایس ڈی کی اسامی پر رکھ لیا۔ صدر ہاؤس میں چند سال کا وہؑ عرصہ مفتی جی کو شہاب صاحب کے بارے میں کچھ سمجھنے، نہ سمجھنے اور پھر حیرت کدہ میںؑ سرگردانی کا دور تھا۔

یہاں تک کہ شہاب صاحب کو بیرونی طاقتوں کے اشارے پر ہالینڈ سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

اگرچہ صدر ایوب ذاتی طور پر شہاب صاحب کی پاکستان کے لیے پر خلوص خدمات اور ان کی ذہانت کے قایٔل تھے۔ لیکن وہی بات کہ جب افراد یا قومیں اپنے فیصلوں میں آذاد نہ ہوں تو بہت سے المیے جنم لیتے ہیں۔

صرف پچھتاوے باقی رہ جاتے ہیں!

بابے پیچھا کرتے ہیں

مفتی جی شہاب صاحب کے ہالینڈ جانے کے بعد بہت خالی خالی سا محسوس کرنے لگے تھے۔ جبکہ شہاب صاحب ہالینڈ میں اپنی روحانی اور ادبی ترجیحات پر توجہ صرف کر رہے تھے۔ اس زمانے میں جو خطوط وہ مفتی جی کو لکھتے رہے، بقول مفتی جی وہ خطوط ان کی زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ تھے۔

ان دونوں بابوں کی زندگی اور آپس کا تعلق بے حد انوکھا اور پر اسرار تھا۔ ایک دوسرے کی موجودگی میں دونوں کا انداز اور بات چیت ایک الگ ہی انداز میں ہوتی۔

میں اکثر نوٹ کرتی اور مفتی جی سے پوچھتی،

''شہاب صاحب کے سامنے آپ کی جون ہی بدل جاتی ہے''

تو بات ٹال جاتے، موضوع بدل دیتے

کچھ رازوں سے پردہ تو اٹھایا 'شہاب نامہ' اور 'ایلی اور الکھ نگری' نے۔ لیکن ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ آئیس برگ کا صرف اوپری حصہ، ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی!

پورا تو وہ تو کہیں گہرے پانیوں میں روپوش رہا!

میرے سوالوں سے مفتی جی زچ بھی ہو جاتے کبھی، ''بس جتنا معلوم تھا لکھ دیا اب اور کیا بتایوں تمہیں''؟

''میں کہتی، ''اصل باتیں تو آپ دونوں چھپا گیے۔ معاملات ان واقعات سے کہیں بہت آگے کے تھے لگتا ہے

''مسکرا دیتے۔ ''تے فیر اگے جا کے پتہ لالییں ایتھے کیوں پچھدی ایں

مفتی جی جو کسی زمانے میں حالات وواقعات کی زد میں آکر دہریت کا نعرہ بلند کر بیٹھے تھے۔ بابوں اور شہاب صاحب کے ساتھ جڑ کر اللہ میاں کو اپنا بیٹھے۔ یہ 'حادثہ' ان کے ساتھ کچھ انداز میں رونما ہوا کہ وہ خود سٹپٹا گیے کہ اللہ میاں دھونی مار کر ان کے اندر بیٹھ گیے تھے۔ بڑی کوشش کی بار بار رسہ تڑوانے کی مگر۔۔۔

طرہ یہ کہ شہابؒ صاحب کی دھیمی دھیمی گرم پھوار انہیں پگھلانے اور گلانے لگی۔

انہوں نے بہت ہاتھ پایوں مارے احتجاج کیا خود کو 'کوکڑو' ثابت کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔

آخر انہوں نے ہار مان لی، قلم سے اقرار 'لبیک' کی صورت نکلا۔

مفتی جی جز بز ہوتے رہے، اللہ میاں مسکراتا رہا ان کے رواں رواں میں سماتا رہا اور مفتی جی باہر بھی اس کی 'تلاش' میں سرگرداں ہو گیے بلکہ بہتوں کو ساتھ لے لیا۔

!!دہریت' سے 'لبیک' تک کا سفر بہت کٹھن تھا۔ آبلہ پایی اور جنون کے ہاتھوں جگ ہنسایی

صبر آزما اتنا کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ جانے کب اور کیا سمایی من مٰیں ؟ کیا کھوج تھی کہ مفتی جی دربہ در بھٹکے ؟ کیی سال بابوں، بزرگوں کے پاس جاتے رہے۔ کسی پیر کا پتہ ملتا چل پڑتے، لیکن انہیں جس پیر کامل کی تلاش تھی وہ انہیں آزما رہا تھا۔ ان کے جذبوں کی آنچ کو جانچ رہا تھا۔

تلاش کی اس راہ پر انہیں ڈالنے والے ان کے دوست عزیز ملک تھے۔

یونہی باتوں باتوں میں وہ مفتی جی کو راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے پاس واقع کویلہ سنٹر لے گیے وہاں ایک 'جنوں والا بابا' ہوا کرتا تھا۔ مفتی جی کچھ عرصہ وہاں جاتے رہے مگر پیاس نہ بجھی بلکہ تشنگی سوا ہو گیی۔

عزیز ملک انہیں اب کی بار مریڑ چوک پنڈی میں سایین جی کے مزار پر لے گیے۔ وہ راستہ بھی ان کی منزل نہ بن سکا۔ بھڑکن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ تپش ان کا من جلا رہی تھی۔ بے چینی نے عجب کھیل رچا رکھے تھے۔

! مری کے مشہور بزرگ 'بھائی جان' کے ساتھیوں کے درمیان بھی کچھ وقت گزارا مگر وہی بے چینی

مفتی جی کا یوں مارے مارے پھرنا ایک دربار سے دوسرے دربار، در گاہ در در گاہ کسی خاص منزل کی تلاش اور تڑپ تھی لیکن منزل کہاں تھی ؟ ابھی کتنی دور تھی ؟

مفتی جی پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے لیکن میٹرک اور ایف اے پاس استادوں کے پاس چکر کاٹ رہے تھے۔

شاید ایک ایک کر کے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھایی جارہی تھیں انہیں۔ تیز چلنے سے سانس پھولنے لگتا ھے نا۔

اکثر مسافر تو آدھے رستے ہی سے پلٹ جاتے ہیں یا کسی ایک مقام پر ہی رک جاتے ہیں۔

یہ سفر عام سفر نہ تھا، بہت کٹھن تھا عشق مجازی سے عشق حقیقی کی جانب کا سفر ہڈیاں چٹخا دیتا ہے۔ چاٹی میں رڑکا رڑکا کر مکھن نکالتا ھے۔

فرایڈ کو ماننے والے جانے کس کی کھوج میں گلی کوچوں میں سرگرداں تھے ؟ ان کی روح کیوں بے چین تھی ؟ کویی سرا ہاتھ نہ آرہا تھا ان کے۔ مفتی جی کے روحانی ارتقا کا یہ سفر کیی سالوں پر محیط رہا۔

پھر یوں ہوا کہ وہ شہاب صاحب کے ساتھ حج پر گیے۔

وہاں انہیں ایک بیوروکریٹ کا کویی اور ہی روپ نظر آیا۔ انہیں ادراک ہونے لگا کہ ان کی آبلہ پایی، کیی در کھٹکھٹانا اور مایوس لوٹنا دراصل مرشد کامل تک پہنچنے کا بہانہ تھا۔ کسی کی تلاش تھی۔ تلاش ختم ہویی مفتی جی شانت ہو گیے ۔انہوں نے مودب ہو کر شہاب صاحب کا دامن تھام لیا۔

لبیک اسی حج کی روداد ھے جو ۱۹۷۵ میں چھپی۔ مفتی جی کے اندر دہریت کا بت ٹوٹ چکا تھا ۱۹۸۰ میں شہاب صاحب کی کتاب 'ماں جی' پر جب انہوں نے مضمون پڑھا تو من کی آنکھ سے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ مفتی جی کے اندر اللہ میاں کی قبولیت اور محبت کا لاوہ ابل رہا تھا۔

پہلے وہ سمجھتے تھے کہ اللہ کو نہ بھی تسلیم کریں تو کیا فرق پر تا ھے اپنی ضرورت کے لیے کوئی بھی خدا تراشا جا سکتا ہے۔

لیکن حج کے بعد انہیں احساس ہونے لگا کہ اللہ تو ان سے ان کی توجہ نہ ہونے کے باوجود بھی پیار کیے جا رہا ھے ان کی خواہشوں کا خیال رکھتا ھے تاکہ ان کا رخ سیدھا رہے، وہ مزید بگڑنے نہ پاییں تو انہیں اللہ میاں سے پیار ہو گیا اور وہ اس سے لاڈ کرنے لگے، انہیں احساس تھا کہ وہ لاڈ میں جانے کہاں کہاں بگڑنے لگے اور اللہ میاں نے کیسے کیسے ان پر مہربانیاں کیں۔

مفتی جی کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے شہاب صاحب کو بہت پرموٹ کیا حالانکہ وہ برملا ہر موقع پر کہتے تھے، "

مَیں تو شہاب کو چھپاتے چھپاتے تھک گیا ہوں، میں نے تو عشر عشیر بھی نہیں بتایا جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا شہاب کے بارے میں۔"

اس بات کی تو میں بھی گواہی دیتی ہوں صرف ایک سال کے عرصے میں، جبکہ میں کسی بھی لحاظ سے شہاب صاحب کے پاسنگ بھی نہ تھی، کسی کھاتے میں نہ تھی، مجھ پر ایسے ایسے پہلو آشکار ہوے ان کی ذات کے کہ میں اس دنیا کے روایتی اور کچے رنگوں کی حقیقت بہت حد تک جان گیی۔

وہ تو مفتی جی تھے ایک جہاں کا علم اور تجربہ تھا ان کے پاس، اور پھر ۳۰ سال سے زیادہ عرصہ تک شہاب صاحب کا ساتھ، جانے کیا کیا انکشافات ہوے ہوں گے، ادراک کی کن کن گھاٹیوں سے گزرے اور کیا کیا دیکھا ہو گا؟

!! کیسے کیسے جوار بھاٹوں نے ان کے من کی دنیا کو تہہ دوبالا کیا ہو گا؟ کون جانے

لبیک' میں ایک جگہ وہ شہاب صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں،

قدرت اللہ ایک تنگ منہ کا مرتبان ہیں اور انہوں نے التزاما اپنے علم اور مشاہدے کے پانی کی سطح اتنی نیچی "
رکھی ہویی ہے کہ اس سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے مرتبان میں بہت سے پتھر پھینکنے پڑتے ہیں تب کہیں جا
"کر طالب کی چونچ ہری ہوتی ہے۔ اسقدر ہری نہیں کہ پیاس مٹ جایے، بلکہ اسقدر ہری کی تشنگی بڑھ جایے

شہاب صاھب نے جب انہیں بتایا کہ وہ دونوں اکٹھے حج کرنے جارہے ہیں تو مفتی جی کو شاید حج کی اہمیت کا اتنا
اندازہ نہ تھا۔ وہ شہاب صاحب سے حج کے بارے میں پوچھتے رہے اپنے تجسس کی تسکین کی خاطر مگر شہاب
صاحب رواجی سے جملوں سے آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ وہ مفتی جی کو عملی طور پر حج کے بارے میں جواب دینے
کی تیاری کر رہے تھے۔

!شاید مفتی جی کے اندر ابھرتے سوالات کو تشنہ رکھ کر پیاس کو بڑھارہے تھے ان کی

مفتی جی کہا کرتے تھے کہ میں نے اسلام کو کسی کاروبار یا ذاتی مفاد کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا بلکہ اس کی حدود
میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ کہیں اسلام میلانہ ہو جایے پر شہاب جانے کب اور کیسے مجھے اللہ میاں کے پاس گھسیٹ
لایا اور وہ بھی اتنی چالاکی سے کہ مجھے خبر ہی نہ ہویی۔

یہ باتیں یہ سوچیں کسی عام آدمی یا دوجمع دوچار والے دانشور کی نہیں ہو سکتیں۔ یہی انفرادیت ممتاز مفتی
کو دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کرتی ہے۔

! مفتی جی ایسے ہی تھے الگ سے انوکھے سے

ان پر کیچڑ اچھالنے والے دراصل ان سے حسد کرتے تھے یا ان کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

ان کے الفاظ ان کی ہستی ان کے اعمال سب بظاہر بے ترتیب ہوتے ہوئے بھی ایک خاص ترتیب میں تھے۔ وہ ترتیب شاید جسمانی آنکھ کی حدود سے بہت پرے تھی۔

!!من کی باتیں من والے ہی جانتے ہیں

شہاب صاحب سے تعلق کے بعد انہیں اللہ میاں اور اللہ میاں کے معاؔملات پر گفتگو کرتے ہوئے ایک خاص مقام کے بعد چپ لگ جاتی تھی۔ پھر بھلے کتنا بھی زور لگالو، وہ کچھ نہ بولتے یا بات کا رخ کسی اور جانب موڑ دیتے۔ شہاب صاحب کے روحانی معاملات تو تھے ہی پر اسرار مگر مفتی جی بھی جانے کن راستوں کے مسافر ہو چکے تھے ؟

کس منزل پر قیام تھا اور ابھی کتنی دور جانا تھا انہیں؟ یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

مفتی جی نے غیر رسمی طور پر شہاب صاحب کو اپنا مرشد مان لیا تھا اور مرشد بھی کیسے جو خود پر پردہ ڈالے بیٹھے تھے ۔سب کو 'شش شش' کر کے خاموش کروانے والے۔ یہاں کسی کم ظرف کسی چھوٹے پیمانے والے کا کوئی لینا دینا نہ تھا۔

!جو چھلک جاتا وہ دایرے سے باہر ہو جاتا

پاکستان اور اسلام کو دل سے قبول کرنے والے پر خلوص لوگ استعماری قوتوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے۔ دنیا کی تاریخ اس حقیقیت کی گواہ ھے۔ بلکہ ہر وطن پرست قوم پرست جو انسانیت کا بھی پرچار کرے، ان کی آنکھوں میں کھٹکتا ھے چاہے وہ کسی بھی خطے یا مذہب سے ہو۔

ان باتوں کا ادب سے گہرا تعلق ھے کہ ادب و ثقافت ہی ایسا چور دروازہ ہے جسکے زریعے کسی بھی قوم کے تشخص پر شبخون مارا جا سکتا ہے۔ اس کی شناخت کو مشکوک بنایا جا سکتا ہے۔

ان بھٹکے ہوئے ذہنوں کے ذریعے، جو لالچ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اندر سے کھٹکے کھولتے ہیں۔ میر جعفر اور میر صادق کی ہر دور ہر میدان میں وقت اور سہولیات کے حساب سے شکلیں اور انداز بدلتے رہتے ہیں۔

مفتی جی اور شہاب صاحب ایسی بہت ساری شکلیں پہچانتے تھے، شاید یہی ان کا جرم تھا

عکسی کا لوک ورثہ

مفتی جی کو میں نے کبھی کسی کے ساتھ گھر میں یا باہر طنزیہ اور ہتک آمیز رویہ اپناہے نہٗں دیکھا۔ بلکہ سب انہیں محبت بھری دانٹ پلا جاتے ان کی صحت یا آرام کے حوالے سے اور وہ بچوں کی سی شرارت سے مسکراتے رہتے اور کرتے اپنی مرضی، مگر اپنی ذات کی حدود تک!

اس گھر میں حقیقی جمہوریت تھی۔ تیسری دنیا کے ممالک جیسی نہیں!!

سب کو برابر حقوق کے ساتھ ساتھ اپنی رایے اور فیصلوں میں خاصی آزادی حاصل تھی۔ کھلا ڈلا محبت بھرا ماحول تھا۔

عکسی اگرچہ مفتی جی کی پہلی بیوی ان کی محبت، کی نشانی ہیں۔ امی جی ان کی سوتیلی ماں تھیں مگر کم از کم مجھے اتنے سالوں میں وہاں کبھی کسی قسم کا کویی سوتیلا پا نہیں محسوس ہوا۔

ایسا ماحول تو اکثر نام نہاد لبرلز کے گھروں میں بھی نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کا عورت سے متعلق نعرہ آزادی محض دوسروں کی عورتوں کی مادر پدر آزادی تک محدود ہوتا ہے۔

عکسی اور مفتی جی کا تعلق عاشق و معشوق سا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ہر موضوع پر کھل کر بات کرتے۔ عکسی کو میں نے ہمیشہ انہیں مفتی جی یا 'سر' ہی مخاطب کرتے سنا۔ لگتا تھا ایک جسم ہے تو دوسرا روح۔ عکسی کو دیکھ کر مفتی جی کی آنکھوں میں جو چمک ابھرتی تھی وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔

عکسی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا رخ ثقافت اور کلچر کی جانب موڑ دیا۔ لوک ورشہ انہی کا لگایا ہوا پودا ہے جسے بعد ازاں حکومت نے اپنالیا۔ عکسی کے بعد جانے وہاں سے کیسے کیسے لوگوں نے فیض اٹھایے اور کن مقاصد کی آماجگاہ بنایہ ادارہ؟ وہ ایک الگ کہانی ھے

میں نے جب قاید اعظم یونیورسٹی سے انٹر نیشنل ریلیشنز میں ایم اے کر لیا تو مجھے فوری طور پر بنک میں فارن اسسٹنس کے شعبے میں ۷ اگریڈ کی نوکری مل گیی۔ جہاں بین الا قوامی اداروں اوراعلی حکومتی افسران سے رابطے رہتے تھے، شوفر والی گاڑی میں پھرنا، میٹنگز ڈنرز وغیرہ خوب ٹھکہ اور موجیں تھیں۔

ایک دن مفتی جی کہنے لگے، ''شہابہ تم تخلیق کار ھو کر بنک میں کیوں کھپ رہی ھو یہ تمھاری جگہ نہیں''۔

''میں نے کہا، ''مزے سے شاہی نوکری کر رہی ھوں ٹھاٹھ ہی ٹھاٹھ

کہنے لگے، ''یہاں تمہارے اندر کی تخلیق کار پریشان ھو گی۔ تم لوک ورشہ میں اسی گریڈ میں جاب کر لو۔ وہاں میڈیا سنٹر میں پوسٹ خالی ھے''۔

میں نے کچھ دن سوچا۔

بنک میں بظاہر دنیاداری کے حساب سے خاصی کشش اور مراعات تھیں۔ مگر لوک ورشہ میں تخلیقی تسکین۔ میں نے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز اور ذہنی سکون کو مالی مفادات پر زیادہ ترجیح دی ہے زندگی میں۔

سو عکسی سے بات کی۔

'' ہنسنے لگے، ''تمہیں مفتی جی نے یہ مشورہ دیا ہو گا

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا

"کہنے لگے، ''چلو ایسا کرو درخواست بنا لاؤ دیکھتا ہوں۔

منسٹری میں میرا کیس گیا اور جلد ہی لوک ورثہ میں میڈیا سنٹر کی پروگرام ایگزیکٹو کے طور پر تعیناتی ہو گئی۔

کچھ لوگوں نے سراہا اس فیصلے کو لیکن اکثریت نے شاید میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہوئے میرے اس 'بے وقوفانہ قدم' پر باقاعدہ افسوس کا اظہار بھی کیا۔ مگر میں خوش تھی!

شکر خورے کو تو شکر چاہیے!

من پسند کام، پروڈکشنز، لوک میلے، فنکاروں سے ملاقاتیں میری

روح کو تراوٹ ملنے لگی۔ وہ ایک سال زندگی کا حاصل تھا۔۔ بہت کچھ سیکھا پروڈکشن میں۔

لیکن عکسی مفتی بالکل بدل گئے۔ مفتی جی کے پاس بھی ملتے تو 'باس' ہی بنے رہتے۔

آفس میں تو سب کی شامت آتی میٹنگ کے دوران۔ ایک ایک پتے کے ہلنے کی خبر ہوتی انہیں۔ خبر کیسے نہ ہوتی کہ لوک ورثہ ان کا بے بی تھا۔ خود بھی بہت دلچسپی لیتے تھے ہر کام کی تفصیل میں اتنی مین میخ نکالتے کہ ہم سبھی کی بھی دوڑیں لگی رہتیں۔ اس کھیاپی نے ہمیں بہت کچھ سکھانے کے ساتھ ساتھ لوک ورثہ کو ایک کمال ادارے کا روپ بھی دیا۔

ڈاکومنٹریز بناتے، میلے سجاتے، ثقافتی شو ہوتے، مزہ آنے لگا۔ چھوٹے غلام علی، عابدہ پروین، فریدہ خانم، اقبال بانو، پٹھانے خان اور کتنے ھی کمال گلوکاروں کی ریکارڈنگ کرتے ہم لوگ۔

عصر حاضر کے نامور موسیقار' کے نام سے ایک میوزیکل وڈیو سیریز بنائي جس میں آٹھ آٹھ گھنٹے کی گائیکی محفوظ ' ہوئي۔ فنکاروں کے حالات زندگی سمیت۔ جس میں سے ایک ایک گھنٹے کا پروگرام ایڈٹ کر کے پی ٹی وی کو دیا گیا ۔

عکسی مفتی کی لوک ورثہ سے عشق اور لگن نے اس ادارے کی عالمی سطح پر بڑی مثبت ساکھ بنائي۔ دوردراز سے مقامی فنکاروں کو متعارف کروایا۔ لوک میلہ کے زریٔعے مضافات سے ہماری ثقافت کے اصل نمایندوں، ہمارے لوک فنکاروں اور ہنر مندوں کو تلاش کر کے ان کی حوصلہ افزائي کی، ان کی عزت نفس کو بڑھاوادیا، باًعزت مقام دیا۔

پاکستان کے عاشق، ایک عظیم لکھاری کے بیٹے سے یہی امید تھی کہ وہ پاکستان کو دنیامیں مثبت انداز سے متعارف کروایے اور عکسی نے یہ کر دکھایا۔

ڈاکٹر شمیم زیدی وہاں ڈایرکٹر تھیں۔ خوبصورت ہنس مکھ اور حوصلہ بڑھانے والی سینیر۔ ہم دونوں صبح جلدی آ جاتیں عادت کے مطابق اور لوک ورثہ کی پگڈنڈیوں پر چہل قدمی کرتیں۔ خوب گپ شپ ہوتی ان کے مشورے بہت پر خلوص ہوا کرتے۔

میڈیاسنٹر میں نسیم اللہ راشد میرے سینیر تھے۔ باقی پوری ٹیم ساجد منیر، کلیم ،اکرام اور عابد۔ ہم سب مل کر خوب لطف اٹھاتے۔ کہتے ہیں شوق کا کوئي مول نہیں اور جب شوق کا مول بھی ملنے لگے تو زندگی کا رنگ ہی بدل جاتا ھے۔ لوک ورثہ کا ماحول ایک گھر جیسا تھا۔

!! ہنستے کھیلتے ہم کام کو بوجھ کی بجایے شوق اور اپنا عشق سمجھ کر کرتے، ہایے کیا حسین دن تھے

اسی دوران میرا نکاح ھو گیا اور صرف ایک سال بعد ھی لوک ورثہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

مگر میری روح آج بھی لوک ورثہ میں بھٹکتی ھے۔

عکسی مفتی اپنے مفتی جی کی ہومیو پیتھی کو ماڈرن تڑکہ لگانے کی خاطر جانے کہاں سے ایک مشین لے آیے۔ ایک ڈبہ ساتھا جس کے مختلف خانوں میں کیی رنگوں اور ساخت کے پتھر تھے۔ اوپر سے ایک پنڈولم سالٹکاتے تھے اور دوستوں یاروں کی شوگر اور بیماریاں چیک ہوتی تھیں۔ ہم سب بھی جمگھٹا لگا لیتے اور عکسی کی جان کھاتے۔

وہ مشین خاصا عرصہ وی آیی پی بنی رہی اس گھر میں پھر اس کی مقبولیت گھٹتی گیی۔

اب وہ مشین عکسی کے سٹور میں دنیا کی بے وفایی پر ناراض پڑی ھے۔

اسے کیا معلوم کہ یہاں تو کتنے ہی انمول انسان ناکارہ مشینوں کی طرح کونوں کھدروں میں پڑے زندگی کی فلاسفی کو سمجھنے کے چکر میں مزید الجھتے جا رہے ہیں۔

لیکن مفتی جی جیسے لوگوں کو کویی نہ بھول پایا۔ شاید انہیں اس ناپایدار دنیا سے کسی چیز کی حاجت نہ رہی تھیٔ سو۔ وہ دلوں میں زندہ ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ھے جیسے وہ کچھ دیر کو کہیں گیے ہیں اور تھوڑی دیر میں واپس آ جاییں گے۔

۔کم از کم میری وابستگی کا یہی عالم ھے مفتی جی ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے ہیں خاص طور جب میں بہت اداس ہوتی !ہوں یا بہت خوش

میں انہیں اپنی ہر کامیابی پر اپنے قریب محسوس کرتی ہوں۔ یہ سب کیا ہے کیوں ہے؟ کویی عقلی تاویل نہیں ہے میرے پاس جسم اور مادے کے چکر میں الجھے لوگوں کے لیے۔ میرا علم بہت ناقص ہے لیکن مجھے اپنے دل اپنی !سوچوں اور اپنے تخیل پر پورا بھروسہ ہے

!اس محبت اس عقیدت کے لیے کسی دلیل، کسی فنڈ، کسی ایجنڈے کی محتاج نہیں ہوتی

چہرے بدلتی زندگی

مفتی جی کا وہ گھر بک بھی گیا لیکن یادیں تو نہیں بکتیں نا، میرے تصور میں وہ گھر اس کے باسی اسی طرح آج بھی محفوظ ہیں۔ جب بھی سوچتی ہوں تو ایک ایک گوشہ پوری تفصیل کے ساتھ میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

اوپر والے حصے میں عکسی اپنی پہلی بیوی اور محبت تہمینہ کے ساتھ دو بیٹوں انس اور نامی سمیت رہتے تھے۔ وہاں جانے کا ایک راستہ باہر کی جانب سے تھا۔ جبکہ دوسرا راستہ اندر لاؤنج سے تھا۔ گول سی آہنی سیڑھی گھومتی ہوئی اوپر جاتی تھی۔

جس کے نیچے کتابوں کے ریک رکھے ہوتے۔ نایاب کتابیں جنہیں میں آتے جاتے دیکھ کر للچاتی اور کبھی کبھار ضد کر کے ایک آدھ پڑھنے کو لے جاتی۔ عکسی اس مّعاملے میں بہت سختی کرتے کہ لوگ لے تو جاتے ہیں کتابیں لیکن پھر واپس نہیں کرتے۔ خیر یہ تو ہمارا قومی مزاج ہے جو ہاتھ آگیا جانے نہ پایے۔

مگر میں اچھے بچوں کی طرح مفتی جی کی راز داری سے دی گیی اجازت کا پاس رکھتی اور کتاب پڑھ کر جلد از جلد واپس کر دیتی۔ بعد میں مفتی جی عکسی کو بتاتے اور خوب شغل لگتا۔ عکسی مجھے نا قابل عمل قسم کی سزاییں ہنستے ہنستے سناتے۔ کیی بار عکسی سے بچنے کو وہیں بیٹھ کر ورق گردانی کرتی۔

تیز تیز باتیں کرنے والی، اونچے اونچے قہقہے بکھیرنے والی تہمینہ اگر گھر ہوتیں تو اکثر نچلے پورشن میں ہی مفتی جی کے ملنے والوں کے پاس یا امی جی اور عسکری کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوتیں۔ ورنہ اپنی نیلی فوکسی میں یا کسی کے ساتھ کہیں کام سے یا اپنی جاب پر چلی جاتیں۔

تہمینہ پی ٹی وی کی ایک بہت پرانی اناہونسر سلمی بیگ کی چھوٹی بہن ہیں مشہور کسوٹی فیم عبید اللہ بیگ ان کے بہنویی تھے۔

نیلی فوکسی میں وہ اکثر مفتی جی کو 'رابطہ' اور حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں کےٗ علاّوہ دوسری تقریبات پر بھی لے جاتیں

عکسی کی صبوحی سے دوسری شادی نے تہمیںہ کو توڑ دیا تھا۔ پر وہ بہت حوصلے کے ساتھ بہت عرصہ اسی طرح اوپری حصے میں رہتی رہیں۔ عمروں کے فرق کے باوجود ہماری اچھی دوستی تھی۔ ایک رات دیر گیے ہم دونوں فون پر بات کرتی رہیں۔

کہنے لگیں، "کبھی کبھی چاہتی ھوں کہ دور چلی جایوں مگر شہابہ مجھے عکسی سے بہت پیار ھے۔ وہ جب بھی آتا ھے "اس کے قدموں کی چاپ سننے کو جاگتی رہتی ہوں۔۔۔۔۔

میری کم عمری اور جذباتی دور، ان کے ساتھ میرے بھی آنسو بہنے لگے۔

زمانوں بعد میں نے پچھلے دنوں عکسی سے اس بات کا ذکر کیا۔

" انہوں نے صرف اتنا کہا، "اچھا؟ پر میرا موقف بھی تو کویی سنتا

جانے اس جملے میں کیا معنی پوشیدہ تھے؟

عکسی کی ذاتی زندگی کے بارے میں لکھنے سے پہلے میں نے ان سے باقاعدہ اجازت چاہی تو انہوں نے خوش دلی سے کہا،

ضرور لکھو میں نے تو اسلامی احکام پر عمل کیا ھے چار شادیاں کر کے"۔ "

ایک وقت ایسا آیا کہ تہمینہ اور عکسی کے راستے جدا ہو گیے۔ لیکن مفتی جی نے اصولی موقف اختیار کیا تہمینہ کے حق میں۔ بڑے حوصلے کا مقام تھا یہ۔ ان کا کہنا تھا کہ تہمینہ عکسی کی پسند تھی کوی اختلاف بھی نہ تھا۔ تہمینہ ہر لحاظ سے اچھی بیوی اور بہو تھی تو یہ زیادتی کیوں؟

شاید ان کے لاشعور یا شعور میں اپنی ماں پر سوکنیں لانے والے اپنے باپ کے خلاف ابھی تک مواد پک رہا تھا۔ شاید اپنے محبوب بیٹے عکسی میں باپ کا عکس برداشت نہ کر پایے۔ سو ان کے جیتے جی صبوحی اس گھر میں قدم نہ رکھ سکیں۔

حالانکہ صبوحی سے بھی ان کے دو پوتے ہیں ایمانی اور اذن۔ مگر انس اور نامی کی جگہ اس گھر میں کوی نہ لے سکا۔ والدین کی جدای کے وقت انس اور نامی کسی حد تک سمجھدار ہو چکے تھے۔

لوک ورثہ کے زمانے میں ہی پیا گھر سے بلاوہ آ گیا۔ شادی کے کارڈ میں نے انجم خلیق کے ذمے لگایے تھے کہ تمام ساتھی اور سینیر لکھاریوں میں بانٹ دے مگر سدا کا بھلکڑ، وہ اللہ کا بندہ تمام کارڈ دراز میں بند کر، شہر سے باہر چلا گیا ۔میں تسلی میں رہی۔ بعد میں پتہ چلا کہ شادی میں صرف مفتی جی اور عکسی نے شرکت کی۔

سبھی دوستوں کا گلہ رہا عرصہ دراز تک۔

مفتی جی اور عکسی میری شادی کی وڈیو میں موجود ہیں میرے نصیب!!۔

مفتی جی کا دیا ہوا خوبصورت تحفہ بھی آج تک میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ جسے پچھلے دنوں میری بہو نے استعمال کے لیے نکالا تو میں نے اسے منع کر دیا کہ ان برتنوں کو ہمیشہ سنبھالے رکھنا یہ مفتی جی کی نشانی ہیں۔

شادی کے بعد بھی مفتی جی کے ہاں آنا جانا رہا۔ دو سال تک میں نے نوکری کو خیر باد کیے رکھا۔ بچے سکول کے قابل ہویے تو نجی شعبے میں ایڈورٹایزنگ میں آ گیی اور اللہ کے کرم سے پہلی جاب ہی ایم ڈی لیول سے شروع کی۔ بعد ازاں میڈیا اور ایڈورٹایزنگ کو ہی کیریر بنا لیا۔

!مگر لکھنا پڑھنا نہ چھوڑا

مفتی جی میری تخلیقی سرگرمیوں پر بہت خوش ہوتے، کچھ تقریبات میں میری درخواست پر مہمان خصوصی کے طور پر شریک بھی ہوئے صحت کی خرابی کے باوجود۔ میں فخریہ انداز میں تمام حاضرین کو بتاتی پھرتی کہ مفتی جی نے صرف میرے کہنے پر ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے۔

کتنا معصوم اور خوبصورت دور تھا تب، نہ تو ادبی ریشہ دوانیوں کی خبر تھی اور نہ ہی عہدوں کی دوڑ میں کم از کم لکھاریوں کی مالی و اخلاقی بدعنوانیوں کے بارے میں علم تھا۔ شاید ایسے حالات کے بارے میں ہی کہا جاتا ھے کہ آگہی کبھی کبھی ٔعذاب بن جاتی ھے۔

حلقہ ارباب زوق کے پرانے ممبران جانتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں حلقے میں تنقید کے لیے پیش ہونے والی میری پہلی تخلیق ایک نظم تھی جس کا عنوان انگریزی میں تھا(سیج)۔ اسی زمانے میں ایس ٹی این چینل اور ہالیڈے ان میں فراز کی صدارت میں دو چار مشاعرے پڑھے۔

میں نے اپنی جانب سے بڑا تیر مارا اور فخریہ انداز میں مفتی جی اور منشا یاد کو مشاعروں کی روداد سنایی۔ دونوں چپکے سے سنتے رہے۔ بات ختم کی تو ایسی سرزنش کی دونوں نے کہ میں روہانسی ہوگیی۔ تب مفتی جی نے کہا کہ تمھاری نثر بہت عمدہ ھے تم اس پر دھیان دو فی الحال ادھر ادھر وقت ضایع کرنے کی ضرورت نہیں۔

بعد میں کچھ شاعروں، تشاعرات اور شاعری کے جو احوال سمجھ میں آیے تو ان دونوں کی سرزنش کا مطلب سمجھی ۔ وہ بڑے لوگ تھے خالص قلم کار، انہٰیں قلم کے سودے نہیں کرنے آتے تھے۔

استحصالی ادیبوں اور نام نہاد خود ساختہ ادبی خدایوں کی طرح

بلبلے

مفتی جی نے آخری سالوں میں اوکھے لوگ، اور اوکھے، اوکھے اولڑے، اپنے قریبی حلقہ احباب کے خاکوں پر مشتمل تین کتابیں لکھیں۔ ان میں اس ناچیز کا خاکہ 'بلبلے' بھی شامل ھے۔ تب میں شہابہ گیلانی کہلاتی تھی۔ یہ خاکہ دراصل میرے پہلے افسانوی مجموعے 'سچے جھوٹ' کے لیے انہوں نے لکھا تھا۔

قصہ کچھ یوں ھے کہ ۱۹۹۱ میں سوچا کہ افسانوں کی کتاب لائی جایے۔ معروف سینیر افسانہ نگار عذرا اصغر قریب ہی رہتی تھیں۔ بہت اچھے مراسم تھے ان سے۔ ان کے بیٹے امبر کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے اس وقت، میری نیی نیی شادی ہویی تھی۔ دراصل انہوں نے ہی کتاب لانے پر زور دیا اور 'سچے جھوٹ' کا پہلا ایڈیشن تجدید اشاعت گھر کے تحت چھاپا تھا۔

میں نے مفتی جی اور منشا یاد سے کتاب پر فلیپ لکھنے کی درخواست کی۔ شفقت ان کی کہ دونوں نے حامی بھرلی۔ منشا یاد نے تو ایک ایک افسانے پر بات کرتے ہویے میرے کام کو فراخدلی سے سراہتے ہؤے بہت تفصیلی مضمون تحریر کیا۔ اب انتظار تھا مفتی جی کے چند جملوں کا،

''فون آیا اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کہنے لگے، ''اویار اک پنڈ ہو گیا اے

''میں نے پریشان ہو کر پوچھا'' کیا ہوا؟

''فرمانے لگے، ''میں لکھن بیٹھا سی تیری کتاب تے دو لینڑاں پر لکھ بیٹھا تیرے اتے پورا خاکہ ہن کی کریے؟

میری پریشانی ھوا ہو کر مجھے غبارہ بنا کر چھت سے لگا گیی۔

آگ لینے گیے تھے پیغمبری مل گیی۔

سو وہ خاکہ نہ صرف میری کتاب کو معتبری بخش گیا بلکہ مجھے بھی 'اوکھے اولڑے' میں شامل کرکے امر کر گیا۔

شکریہ مفتی جی!! یہ اعزاز دنیا کے عظیم ترین میڈل سے بھی قیمتی ھے۔

حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس اس زمانے میں اقبال ہال میں ہوا کرتے تھے۔ میں باقاعدہ اس کی سرگرم ممبر تھی۔ ۱۹۹۹ میں دوسری خاتون سیکرٹری کی حیثیت سے بلا مقابلہ منتخب ہویی۔ مگر کچھ عرصہ بعد کراچی شفٹ ہو گیی۔ ہم نے حلقے کا بہترین دور دیکھا۔

منشایاد کی زندگی میں بھی حلقہ بہتر رہا مگر بعد ازاں اتنی محنتوں اور محبتوں سے تمام لکھاریوں کی بہتری اور ادب کی ترویج کی خاطر سینچا ہوا یہ پودا ذاتی مفادات، گروہ بندیوں اور منافقت کی نذر ہو کر محض چند لوگوں کے لیے پھلدار ثابت ہو رہا ھے اور بس۔

! شہابہ گیلانی سے فرحین چودھری تک کا سفر کیوں اور کیسے؟ اسی بہانے آج اس قضیے کو بھی نپٹاتی چلوں

میں کراچی منتقل ہویی تو میرے اعزاز میں مختلف اداروں نے تقاریب منعقد کیں۔ تب تک دوسری ۲۰۰۰ کتاب 'آدھا سچ' بھی منظر عام پر آچکی تھی۔ میری کتاب قاسم جلالی تک بھی پہنچی جو کہ پاکستانی ڈرامے کی ڈایرکشن میں ایک بڑا نام ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈرامہ لکھنے کی پیش کش کی۔

یونہی شغل شغل میں پہلا سیریل 'دام رسایی' ان کے جوتشی صاحب ہمایوں محبوب کے کہنے پر فرحین کے نام سے لکھا۔ حیرت کہ وہ سیریل بہت ہٹ ہوا، سو سب کے اصرار پر کہ فرحین نام پروڈکشن کے حوالے سے تمہارے لیے مبارک ہے، میں فرحین چودھری ہو گیی۔

!!یوں شہابہ کا شہر ہی نہیں شناخت بھی بدل گیی مگر نام کی حد تک

میں واپس اسلام آباد آیي تو ایک موقع پر بانو آپا سے ملاقات ہوئي۔ مجھے گلے لگا کر سرزنش کی کہ تم نے نام ۲۰۰۵ بدل کر اچھا نہیں کیا، تمہارے نام سے ہمیں شہاب کی خوشبو آتی تھی۔

ایک مسلہ یہ بھی ہوا کہ میرے قاری پریشان ہوگیے۔ وہ شہابہ کی گمشدگی پر حیران اور کسی فرحین کی اچانک آمد، پزیرایي اور اسی انداز تحریر پر مزید حیران تھے۔

کچھ لوگوں کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا

دیالو بابا

مفتی جی کی قوت برداشت شاید بڑھاپے میں بڑھ گیی تھی۔ جسمانی تکلیف کے باوجود حلقہ اور 'رابطہ' کے اجلاسوں میں شرکت کرتے رہے۔ امی جی ؒعکسی مفتی اور بیٹیاں حتیٰ کہ ؒعسکری بھی لڑتی رہتی۔ سبھی احباب سمجھاتے مگر وہ اپنی ترجیحات نہ بدلتے۔

آخری کچھ عرصہ میں تو گردوں کی تکلیف بہت بڑھ گیی تھی۔ انتہایی ضبط کے باوجود بھی ان کے منہ سے ہلکی سی 'ہایے' نکل جاتی۔ بہت دکھ ہوتا انہیں اس حال میں دیکھ کر۔

امی جی کہتیں بے بس ہو کر،

شہابہ تو ہی سمجھا انہیں، کیوں اتنا خود کو خوار کرتے ہیں؟ یہ سارے تو غرض کے بندے ہیں نہ انہیں آرام کرنے دیتے ہیں نہ کویی کام، حالت دیکھو اپنے مفتی جی کی بول بول کر کتنا تھک جاتے ہیں' کھانسی سے برا حال ہو جاتا ہے پر باز نہیں آتے"۔

مفتی جی اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دیتے،

"او مینوں کجھ وی نییں ہندا میں جے چپ کر گیا تے ہمیشہ لیی چپ کر جاواں گا بول لین دے میں وں کجھ دن"

اس بات پر امی جی جھٹ سے یہ کہتی کمرے سے باہر چلی جاتیں،

"پیڑا ای بولنا تسی جدوں وی بولنا"

میں کہتی،

امی جی آپ کی صحت کی خاطر ہی تو کہتی ہیں نا مان لیا کریں ان کی بات"۔ "

مفتی جی تب سنجیدہ ہو جاتے اور کہتے،

میں مانتا ہوں سب میرے بھلے کو کہتے ہیں مگر کیا کروں، یہ بے چارے عقیدت کے مارے جانے کہاں کہاں "
"سے آتے ہیں کیسے ان کی آس توڑ دوں؟ میرے پاس ہے ہی کیا دینے کو؟ خالی باتیں؟ بول بچن؟

اور پھر عجیب سی خاموشی چھا جاتی۔

میں سوچتی اس بیماری مٰیں اپنے وقت اور صحت سے زیادہ قیمتی چیز وہ کسی کو کیا دے سکتے ہیں؟

حیران ہوتی کہ مفتی جی کیا ہیں کون ہیں؟ ساری دنیا اس چشمے سے سیراب ہو رہی ہے اور وہ کہ رہے ہیں کہ میں سوکھ چکا ہوں۔ وہ دیالو درویش جو ہر جھولی میں چپکے سے خیرات ڈالتا ہو وہ ایسا کیوں کہتا ھے؟ شاید خود کو چھپانے کی کوشش میں کہ بھید نہ کھل جایے۔۔؟

ایسے کیی مسند نشیں ہیں جو ان کے گھٹنوں کو چھو کر کامیابی کی سیڑھیاں چڑھے۔ آج جب میں کہتی ہوں کہ مفتی جی اور شہاب صاحب کے نام پر اسلام آباد کی کویی سڑک کیوں نہیں؟ تو مجھ سے الگ ہو کر طنزیہ کہتے ہیں کہ مفتی تو مر گیا یہ کیوں اس کا نام لیے پھرتی ھے؟

میرے سامنے تو مفتی جی پر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔

بھلا کویی ان سے پوچھے کہ وہ سارے اصلی و نقلی بھی تو مر گیے جنہیں، تراشا گیا، بت بنایا گیا، مفادات کی خاطر۔

جن کا قد مفتی جی سے کسی طور بڑا نہیں مگر انہیٰں آسمان پر بٹھایا گیا۔ ان کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے، شہروں شہروں میڈیا ان کے ڈھول پیٹتا ہے ایسا کیوں ہے؟

کوئی میرے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ جواب ہے بھی نہیں کسی کے پاس وظیفہ خوار کب سچ بولنے کی ہمت کر سکتے ہیں۔ جن کی زبانیں آنکھیں اور کان بلکہ روح تک گروی ہو؟

مفتی جی کے بارے میں ایسی ایسی افواہیں پھیلائی گییں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ بے چارے افواہ سازوں کی طاقت پرواز بس یہیں تک ہے۔ مردہ کو نوچ نوچ کر کھانا اور ہر زندہ کے مردہ ہونے کا اہتمام و انتظار ان کی فطرت !!

مفتی جی کا نام دلوں پر لکھا ہے اسے کوئی نہیں مٹا سکتا!!

ایک حقیقی لکھاری اور درویش جنہیں صلے کی تمنا تھی نہ ستایش کی پرواہ، وہ تو جھولیاں بھر بھر علم بانٹتے رہے ان کا فیض آج بھی جاری ھے۔ شاید یہی ان کی ڈیوٹی تھی اور رہے گی۔

مفتی جی قسم کھا کر بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے امی جی کو نکاح سے پہلے نہیں دیکھا تھا امی جی ہنس کر کہتیں کہ اگر میں دیکھ لیتی پہلے تو 'ناں' کر دیتی۔

وہی اقبال بیگم مفتی جی کے جنازے پر وہ تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھیں،

"مجھے تو آج پتہ چلا آپ کتنے بڑے انسان تھے میں بدنصیب آپ کی قدر نہ کر سکی، مجھے مٌعاف کر دیں"

ہم سب دم بخود تھے۔ اپنی باتوں سے سب کو لاجواب کرنے والے مفتی جی آج یوں خاموش لیٹے ہوں گے؟ وہ شعاعوں سے منور آنکھیں وہ پھلجڑیاں بکھیرتے لب اب کبھی نہ کھلیں گے؟ یقین نہیں آ رہا تھا۔

میرے بیٹے چھوٹے چھوٹے تھے تو مفتی جی انہیں گود میں لے کر تھوڑا اچھالتے اور کہتے۔ "شہابہ ان کی آنکھیں تیرے جیسی ہیں زندہ آنکھیں"۔

امی جی ڈانٹ دیتیں انہیں، "ان کی آنکھوں کی بجایے اپنی حالت دیکھیں بچہ آپ پر گر گیا تو پھر تکلیف ہو گی"۔

''مفتی جی سنی ان سنی کر کے کہتے، '' ان کی ہنسی تو دیکھو ذرا۔۔۔

امی جی بے بس ہو کر مسکرانے لگتیں مفتی جی سے کون جیت سکتا تھا؟

میرے بیٹے چلنے پھرنے لگے تو انس اور نامی جو اس وقت خود بھی ۱۱، ۱۰ سال کے تھے انہیں گھماتے پھراتے مور دکھاتے۔ ان کے پاس سیامی بلیلاں تھیں جن سے گھر والے تنگ تھے۔ بے چاری بلیوں کا عکسی کے حکم پر اندر آنا منع تھا۔ سو وہ باہر پھلانگتی گھومتی نظر آتیں۔

''انس جانے کس دل سے بڑی فراخدلانہ آفر کرتا، ''شہابہ آنٹی آپ اپنے بیٹوں کے لیے یہ بلیلاں لے جاییں

۔ اس لمحے مجھے اس پر بہت پیار آتا۔ کتنے صبر کا مظاہرہ کرتا تھا وہ دل پر جبر کر کے۔

گھر پر چونکہ ہم نے کتے اور پرندے پال رکھے تھے سو اس آفر کو قبول نہ کر سکی۔ لیکن انس اور نامی کی یہ محبت اور مجبوری بھری پیش کش بہت اچھی لگتی۔

انس سے بہت سالوں بعد اچانک ہی کراچی انڈس ٹی وی پر ملاقات ہویی۔

میں اور زیبا بختیار کسی ڈرامے کے سلسلے میں اقبال انصاری سے ملنے گیی تھیں۔ آفس سے نکلیں تو سمارٹ سا اونچا لمبا لڑکا دور سے آیا اور یہ کہ کر مجھ سے لپٹ گیا،

''شہابہ آنٹی آپ یہاں؟ ''

!! ارے۔۔۔

میں یکدم بوکھلا گیی وہ انس تھا۔ کتنا اچھا لگا تھا عرصے بعد اسے مل کر۔ ہم کافی دیر بیٹھے پرانی باتیں یاد کر کے کبھی ہنسنے لگتے کبھی اداس ہو جاتے۔ بچپن میں سیامی بلی کی آفر کرنے والا وہ ٹین ایجر اب بھی ویسا ھی حساس تھا۔ زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ نظر خاصا فلسفیانہ ہو چکا تھا۔

ہم دونوں کراچی بیٹھے بیٹھے اسلام آباد کے اس گھر کے کمروں اور لان میں گھومتے رہے جہاں ہماری کچھ مشترکہ یادیں بھی کونوں کھدروں سے لگی کھڑی تھیں۔ مختلف عنوانات کے سہارے ہم ایک دوسرے کی کہانیاں پڑھ چکے تھے۔

درد مشترک تھا مگر دوا الگ الگ تھی۔

جب میں اٹھی تو میرے گال بھیگ چکے تھے اور انس کا ہاتھ میرے کاندھے کو تھپتھپا رہا تھا۔ بچے کتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ سب کچھ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جو اکثر ہم سمجھ نہٰیں پاتے۔

شاید اس لیے کہ زندگی الٹے قدم نہیں چل سکتی۔ اس کا سفر آگے کی جانب ہوتا ہے۔

انس کے اندر کا آتش فشاں تخلیق کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔

عکسی کی دوسری شادی کے بعد گھر میں خاصا کھنچاؤ رہا۔ تہمینہ دو سال تک اسی گھر میں اوپر والے حصے مٰیں رہیں۔ جانے مفتی جی نے معاملات کو اتنا عرصہ کس طرح سنبھالے رکھا؟

جانے کب کسی لمحے کی بے وفایٔی کی وجہ سے عکسی اور تہمینہ کی آس اور برسوں پرانا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔

دونوں کو ایک دوسرے سے بہت محبت تھی۔ جانے کونسا بد صورت لمحہ ان کے بیچ آن کر بیٹھ گیا تھا جو محبت کی خوبصورتی کو چاٹ گیا۔ ہر لمحے کی اپنی ایک شکل، رنگ اور خوشبو یا بدبو ہوتی ہے اور ویسا ہی اس کا اثر بھی۔

مفتی جی کے چلے جانے کے بعد انس کے ولیمے پر اسی موروں والے لان میں جہاں مفتی جی سردیوں کی دھوپ سینکا کرتے تھے، صبوحی عکسی مفتی کی ساتھی کے طور پر مہمانوں کو ساڑھی میں ملبوس خوش آمدید کہہ رہی تھیں اور جس گھر میں تہمینہ ایک مالکن کے طور پر رہتی تھیں، وہیں وہ بھی ساڑھی پہنے تہمینہ روی کی حیثیت سے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ بطور مہمان داخل ہویٔیں۔

جانے ان سب کے کیمو فلاج چہروں کے اندر کتنے رنگ بدلے مگر میں بہت دنوں تک اس لمحے کی قید میں رہی۔
!!زندگی کتنے روپ بدلتی ھے اور رشتے کتنے بے رنگ ہو جاتے ہیں کبھی کبھار

مفتی جی کے کردار کا ایک اور جاندار اور منفرد پہلو سامنے آیا اس سارے قصے میں۔ انہوں نے تہمینہ کے حق میں آخر دم تک اصولی موقف اپنائے رکھا۔

عکسی مفتی کا اس سلسلے میں کیا موقف تھا؟ مفتی جی سے ان کا کیا اختلاف تھا یہ میں نے جاننے کی کوشش فی الحال نہیں کی۔

کبھی زیادہ کھوج نہیں لگایا کہ یہ بہت ذاتی معاملات تھے مگر افسوس ضرور تھا۔ مفتی جی کا اپنے اکلوتے محبوب بیٹے !کے فیصلے کے خلاف اپنے موقف پر ڈٹ جانا شاید اپنی خاموش ماں کا ساتھ بھی دینا تھا لاشعوری طور پر

ہو سکتا ہے وہ تہمینہ کو اپنی ماں کی جگہ دیکھ رہے ہوں۔ تاریخ اپنے آپ کو کسی اور انداز میں دہرا رہی تھی۔ کیونکہ میں نے مفتی جی کو تہمینہ کے ساتھ ہمیشہ ایک مشفق باپ، ایک اچھے دوست کے روپ میں دیکھا۔

دریا اور

چشمہ--

ریڈیو پاکستان سے میرا تعلق فسٹ ایئر کے زمانے سے قایم ہوا جب ریڈیو پاکستان کی جانب سے ایک آل پاکستان افسانہ نویسی کے انعامی مقبلے میں میرے افسانے 'بہتے پتھر' کو دوسرا انعام ملا جس کا تفصیلی ذکر میری آنے والی کتاب میں ہو گا۔

فی الحال تو اتنا بتانا ہے کہ یونیورسٹی کے دوران مفتی جی کے لکھے ہوئے ایک ریڈیائی ڈرامے 'دھوپ چھاؤں' میں میں نے مرکزی کردار ادا کیا یہ ڈرامہ ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے نشر ہوا اور ڈیڑھ سال تک چلا تھا۔

ارنسٹ ٹھاکر داس اس کے پروڈیوسر تھے۔ اس سیریل میں بہت خوشگوار انداز میں معاشرتی مسایل کو اجاگر کر کے ان کا حل پیش کیا جاتا تھا۔ بہت کاٹ دار تحریر تھی جسے پڑھ کر ادا کر کے بہت مزہ آتا۔

سدرہ ظہیر، طارق بٹ، شاہد ہاشمی اور میں ۴ مرکزی کردار تھے اس مقبول ریڈیائی ڈرامے کے باقی تینوں منجھے ہوئے ریڈیو آرٹسٹ جبکہ میں نے ریڈیو ڈرامہ پہلی اور آخری بار کیا۔

مفتی جی نے میرے کام اور میری آواز کو بہت سراہا۔ باصلاحیت خواتین کو وہ خوب شاباش دیتے کسی صلے کسی لالچ کے بغیر، تعریف کے ہنڈولے میں خوب جھولا جھلاتے، وہ اپنی ماں کی طرح کسی عورت کو بے بس نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

!!شاید یہی ان کا اپنے باپ کی روح سے انتقام تھا

طالب علمی کے زمانے میں پڑھائی کی وجہ سے کچھ گھر سے ڈانٹ ڈپٹ کے باعث ریڈیو کو باقاعدگی سے جاری نہ رکھ سکی۔ لیکن اس عمر میں ممتاز مفتی کے سکرپٹ میں مرکزی کردار ادا کرنے کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

آج بھی سوچتی ہوں تو ایک عجیب سی سرشاری کا احساس مجھے گھیر لیتا ھے۔

مفتی جی اصولوں پر چلنے والے بے غرض انسان تھے۔ کم از کم میں نے تو انہیں چودہ سال کی رفاقت کے دوران درویش منش انسان ہی پایا۔ انہیں بس لکھنے اور لکھنے کی ترغیب دینے اور لوگوں کے مسایل حل کرنے کا شوق تھا۔

اکثر اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کی خاطر اپنے رابطوں کو استعمال کرتے دیکھا۔ بے انصافیوں اور معاشرے کی منفی روش پر کڑھتے بھی تھے۔ لیکن عملی طور پر اس کو بدلنے کا حوصلہ بھی دیتے تھے۔

دو مواقع پر میں نے انہیں بہت دیادہ دکھی محسوس کیا مگر یہ دکھ انہوں نے بہت حوصلے کے ساتھ برداشت کیے۔ بس ان کی آنکھیں بولتی رہیں۔

قدرت اللہ شہاب کی وفات پر میں نے غیر معمولی طور پر انہیں خاموش اور اداس دیکھا۔ یوں جیسے کسی کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ ان کا انگ انگ یوں اداس تھا جیسے روح ساتھ چھوڑ گیی ہو۔ خالی خالی نظروں سے وہ چاروں جانب دیکھ رہے تھے۔ جیسے جانے والے کو ڈھونڈ رہے ہوں۔

دوسری بار وہ تب دکھی ہویے جب ان کے ناول 'علی پور کا ایلی' کو نہ جانے کن 'وجوہ' کی بنیاد پر رائیٹرز گلڈ ایوارڈ نہ دیا گیا۔ اس کی جگہ جمیلہ ہاشمی کے ناول تلاش بہاراں کو اس ایوارڈ کا حق دار سمجھا گیا۔ اس بار بھی وہ خاموش ہی رہے۔

مگر انہوں نے وہ، ناول مجھے یہ الفاظ لکھ کر دیا۔

شہابہ انور خبر دار اسے پڑھنا نہیں یہ کتاب پاس رکھنے کے لیے ہے پڑھنے کے للیے نہیں اس کتاب کو پڑھنے ”
“ سے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ ھے۔۔ ممتاز مفتی ۱۰۔ ۱۱۔ ۸۵

اس تحریر میں چھپے درد کو میں محسوس کر سکتی تھی۔ اندازہ ہے کہ اس ناول کو اس کے حق سے محروم کرنے کے لیے یہی اٗعتراض لگایا گیا ہو گا۔ جبکہ اس مٰیں سرے سے ایسی کویی بات تھی ہی نہیں۔

ہاں البتہ بہت سے بگڑے اخلاق والے، تمام اخلاقی اقدار کو پامال کرنے والے ہمارے ادب و ثقافت کے ناخدا بھی بنے رہے اب بھی ہیں !

!!بڑے بڑے ادبی اور قومی ایوارڈ کے حق دار بھی ٹھہرے، ان کے بارے میں کیا کہا جایے؟

اس وقت میں دنیا کی اونچ نیچ سے ناآشنا ایک نوجوان طالبہ تھی۔ اس ناول نے میرا اخلاق تو نہ بگاڑا مگر اسے اخلاق سے گری کتاب کہنے والوں کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کر دیا۔

مفتی جی اور شہاب صاحب اکثر رات گیے پروفیسر رفیق اختر کو ملنے گجرانوالہ ملنے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان ملاقاتوں کی تفصیل سے ہم کافی حد تک لاعلم رہتے تھے۔ البتہ اس سرگرمی کے بعد مفتی جی کچھ دن بہت پرجوش نظر آتے۔

کچھ نیی نیی باتیں کرتے زندگی کے بارے میں، جیسے کسی کو کویی نیی چیز نظر آجایے، جیسے بیٹری ریچارج ہو جایے
۔

منشایاد سے ادبی مطابقت کے باوجود روحانی معاملات پر دونوں کی بحث رہتی۔ خاص طور پر پروفیسر رفیق کے حوالے سے منشایاد خاصے جزبز ہوتے۔ مفتی جی انہیں جان بوجھ کر چھیڑ دیتے اور پھر مسکراتے رہتے۔

چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود دونوں قلم کی عزت و تکریم کے ساتھ اس کی ترویج پر بھی متفق تھے۔ سو 'حلقہ ارباب ذوق' اور 'رابطہ' کامیابی سے چلتے رہے اور سبھی رابطے بحال رہے۔

!!اب تو ادبی دنیا کے بارے کیا کہیں 'کیا نہ کہیں؟ بہتر یہی ہے کہ چپ رہیں

وصال سے کچھ عرصہ پہلے کہنے لگے کہ اگر میرے بعد کویی مسلہ پیش آیے تو پروفیسر رفیق سے مل لینا رہنمایی کریں گے۔

۔۲ میں پروفیسر رفیق اختر سے ملی۔ چکلالہ سکیم میں ان کے گھر پر دنیا جہاں سے آیے ہویے لوگ ٹوکن کے ۱۰ !!! ذریعے گھنٹوں انتظار کرتے اور ملتے۔ یوں جیسے گڑ پر شہد کی مکھیاں

کھچا کھچ بھرے کمرے میں حاضرین کے سامنے ایک میز رکھے کچیم شچیم داڑھی مونچھ کے بغیر عینک پہنے پروفیسر صاحب بیٹھے تھے۔

اپنی باری پر میں بھی ضابطے کے مطابق انکے قریب رکھی کرسی پر جا بیٹھی۔ سرگوشی کے انداز میں اپنا نام بتا کر مفتی جی کا حوالہ اور بس ہلکا سا اشارہ اپنے مسلے کا دیا۔

انہوں نے میری جانب دیکھے بغیر دبی ہوئی آواز مٰیں کچھ ایسا کہا کہ میں لرز گیی۔ لگا وہ میرے وجود کے آرپار دیکھ رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے پرزے پر اللہ کے چند نام لکھ کر ان کا ورد کرنے کو کہا۔

یہ سب کچھ ۳۰ سے ۴۰ سیکنڈ میں ہوا میں نہ جانے کس ٹرانس میں چلتی ہوئی گاڑی میں آن بیٹھی۔ دیر تک سٹیرنگ پر سر رکھے روتی رہی۔

مفتی جی بے طرح یاد آرہے تھے۔ وہ ہم سے دور جا کر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس چشمے کا فیض اب تک جاری تھا ۔ کہاں کہاں اور کیسے؟ کس کس انداز میں؟ کون جانے؟

پروفیسر صاحب کو اس کے بعد کبھی نہ مل پایی مگر اندر کی ساری چولیں ہلا کر رکھ دیں انہوں نے۔ مفتی جی ایسے ہی تو نہیں ملنے جاتے تھے انہیں۔

کویی دریا تھا ایسا جو چشموں کی پیاس بجھاتا تھا یا چشمے دریا کو سیراب کرتے تھے؟ یہ راز نہ کھل پایا۔۔

رابطہ، چھڈیار اور بد تمیز بیٹا

رابطہ 'ایک ادبی تنظیم تھی جس کے بانی ممتاز مفتی اور منشایاد تھے۔ رابطہ میں شمولیت کی شرایط بہت کڑی تھیں۔ ' بڑے بڑے لکھاریوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اس میں شامل نہ ھو سکے۔

اسکے ممبران میں بانو آپا، اشفاق احمد، ڈاکٹر پرتو روھیلا، وقار بن الہی، ڈاکٹر رشید امجد، جلیل عالی، ابدال بیلا، شمیم اکرام الحق، فریدہ حفیظ، افتخار عارف، بلقیس محمود، ثروت محی الدین، قدرت اللہ شہاب، منشایاد، ضیا جالندھری، پروین عاطف، ڈاکٹر جمیل جالبی، اختر جمال، اختر علی احسن، منیر شیخ جمیل نشتر، مسعود مفتی آغا ناصر، ادا جّعفری، مختار مسعود اور احسان اکبر کے علاوہ ایک دو اور ممبران بھی تھے۔ بہت سارے سینیرز کو تو میں نے کبھی نہیں دیکھا اجلاس میں۔ جیسے جمیل نشتر، ادا جعفری مختار مسعود۔

بعد میں شبانہ حبیب اور نیلو فر اقبال بھی شامل ہویں۔

ماہانہ اجلاسوں میں ممبران اپنے شریک حیات کے ساتھ شامل ہوتے۔ کبھی کبھار کوپي مہمان قلم کار بھی شرکت کر لیتا۔ میرے ہاں بھی کچھ اجلاس ہویے رابطہ کے۔ جن میں ضمیر جعفری، عذرا اصغر کے علاوہ بھی کچھ مہمان لکھاری شامل ہویے تھے۔

اجلاس ہر ماہ باری باری کسی نہ کسی ممبر کی میزبانی میں ہوتا۔ دو تخلیقات پیش ہوتیں ان پر تبصرہ نہ تو بے لاگ ہوتا اور نہ ہی کسی بغض کی بنیاد پر کسی کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔ (جیسا کہ آجکل ادبی حلقوں کا طرہ امتیاز ھے)

میں چونکہ سب سے کم عمر ممبر تھی سو میرے کچھ ہم عصروں کو کافی تکلیف تھی۔ ایک صاحب جو بعد میں بڑے جتنوں سے ادبی حلقوں اور سیڑھیوں کو استعمال کر کے عظیم دانشور کہلانے لگے ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر منشا یاد کا دست راست بن کر رابطہ میں شمولیت کی خاطر خاصے پاپڑ بیلے۔

منشا یاد نے میرے سامنے بہت سفارش کی ان صاحب کی کہ انہیں اعتراض ہے کہ شہابہ بھی تو بہت جونیر ہونے کے باوجود 'رابطہ' کی ممبر ھے۔

مفتی جی کا جواب مجھے آج بھی یاد ھے انہوں نے صاف کہا۔

اسے کہ دو جو سپارک شہابہ میں ھے اس میں نہیں۔"۔ "

آنے والے وقتوں میں میرے ان دانشور ہم عصروں نے 'سپارک' پیدا کرنے کی خاطر جانے کہاں کہاں کس کس 'بیٹری' سے 'کنکشن' لیے۔ کوئی تنقید نگار بن گیا تو کوئی محض مسند نشینوں کی 'خدمات' کی بدولت معتبر شاعر و ادیب بن بیٹھا۔

ایوارڈ و تمغات ہر 'قیمت' پر حاصل کیے گیے۔

لیکن یہ بے چارے چند کلیوں پر قناعت کرنے والے کیا جانیں جو ایوارڈ مجھے مفتی جی اور شہاب صاحب کی توجہ کی صورت مٰیں ملا، جو خوشی اپنی تخلیق کی کامیابی پر کسی مافیا یا گروہ کی 'مدد و تردد' بغیر حاصل ہوتی ھے اس کا مقابلہ یہ کاغذ و دھات کے ٹکڑے بھلا کیسے کر سکتے ہیں؟۔

رابطہ ٔ کار یکارڈ منشایاد کی ڈایری اور کیمرے میں محفوظ ہو تا تھا جسے کچھ 'عظیم 'لوگوں نے منشایاد جیسے سادہ لوح ' ادیب کو مرعوب کرنے کے لیے کمپیوٹر میں محفوظ کرنا شروّع کر دیا۔ وہ ریکارڈ جانے اب کہاں اور کس حال میں ھے؟

مفتی جی نے دوستوں کو لکھنے پر راغب کرنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ سوچا، ایک تنظیم کسی زمانے میں بنایی 'چھڈ یار' کے نام سے، یعنی دنیا کے باقی کام چھوڑو، دامن چھڑایو ہر ایشو سے، انگلی پکڑو اپنی اور کہیں نکلو، گھومو پھرو پھر جم کر لکھو!!!۔

اس تنظیم کا ذکر ان کی زبانی سنا تھا کیونکہ یہ سب مجھ سے بہت پہلے کی باتیں اور گھاتیں تھیں۔

مسعود قریشی، محمد عمر، اشفاق احمد، اعظمی اور مفتی جی نکل پڑتے تھے کہیں نہ کہیں۔ عکسی مفتی کے پاس جیپ تھی سوڈیوٹی لگتی ان کی سب کو لے جانے کی۔ سفر کے دوران بحثیں ہوتیں گپ شپ لگتی کھلی ڈلی،

!!سب اپنی اپنی خلعتیں اور چولے اتار کر آتے تھے اپنے اصل کے ساتھ، اپنے اندر کے بچے کو زندہ رکھنے کو

مفتی جی اکثر مجھے بھی کہا کرتے تھے،

" شہابہ اپنے اندر کے بچے کو کبھی نہ مرنے دینا یہی تمہاری طاقت ہے اور یہی تمہیں شر سے بچایے گا"

کتنا بڑا سچ اور کتنی گہری حقیقت بیان کی تھی انہوں نے۔

جنگلوں صحرایوں میں وقت کی قید سے آزاد گھومنے، مختلف معاشرت اور ماحول میں وقت گزارنے سے لکھنے کی تحریک وترغیب ملتی۔ کویی لکھتا کویی نہ لکھتا لیکن دلچسپ تجربات پر بات ضرور ہوتی۔

یہ بوڑھے لوگ چھڑیاں لیے روٹین، گھرداری اور کام سے دامن چھڑا کبھی چترال جا پہنچتے تو کبھی تھرپارکر، کبھی ہنزہ اور گلگت کی فضایوں میں جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے اور ان سب کو گسیٹنے والے ہوتے ممتاز مفتی!!

خود انہوں نے سفر نامہ تو نہ لکھا مگر ناولوں اور کہانیوں کے لیے مواد خوب اکٹھا کیا۔ شایید مفتی جی کے ذمے تحریک پیدا کرنے کی ڈیوٹی لگی تھی۔

ان کی باتوں میں الفاظ میں اور اندر باہر کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ چند لمحوں میں ایک ملاقات میں ہی ملنے والے کو اپنے بارے میں بار بار سوچنے پر مجبور کر دیتے۔ ان کے کیی پرستار ایسے بھی تھے دنیا بھر میں، جو انہیں کبھی نہ ملے تھے لیکن خط و کتابت اور مفتی جی کی تحریروں کے راستے ہی ان کو دل میں اتار بیٹھے تھے۔

چھڈیار' کی مہم جویی کے دنوں میں اکثر دور دراز علاقوں میں بھی ان کے مداح مل جاتے۔ ویسے بھی لوگ جانتے' پہچانتے تھے، سو خوب آیو بھگت بھی ہوتی۔ ان کا دوست، ان کا بیٹا عکسی جو جوانی میں ہی ان کی دوستی میں بوڑھا ہو چکا تھا، ہر سفر میں ہم رکاب اور ڈرایور!

مفتی جی نے کرنل ابدال بیلا کو بھی 'چھڈیار' میں شامل کرنا چاہا مگر باقی یار نہ مانے۔ صرف ایک ٹرپ پر انہیں ساتھ جانے کی اجازت ملی۔

وہ بھی یوں ہوا کہ عکسی نے معاملہ نپٹانے کو نعرہ لگایا کہ مجھے ایک کلینر کی ضرورت ہے دوران سفر اگر میں ڈرایور ہوں تو میرا کلینر کم از کم کرنل تو ہونا چاہیے۔ عکسی کی اس چالاکی سے بس ایک ہی بار ابدال بیلا ان بابوں کے ہم سفر بن سکے۔

مفتی جی کی اس معاملے پر دوبارہ نہ سنی گیی کہ 'چھڈیار' کی جمہوریت اصلی تھی۔

ان باپ بیٹے کا تعلق بھی عجیب تھا،

مفتی جی نے شاید رشتوں سے کسی زمانے میں تنگ آکر عکسی کو بھی سمجھا دیا کہ کوئی ماموں نہ چاچو۔ ہر چھوٹے بڑے کا نام لیناھے کوئی انکل نہ بھائی۔ عکسی کا تو دنیا میں باپ کے سوا کوئی دوست ہی نہ تھا، انہوں نے اشفاق احمد کو شقو، اور باقی سب کو ان کے ناموں سے ہم جولیوں کی طرح پکارنا شروع کر دیا۔

مفتی جی کے ادبی سفر کے ابتدائی دنوں کے ادبی دوستوں میں عماد الدین، مسعود قریشی، اشفاق احمد، احمد بشیر اور مختار مسعود جیسے نامی گرامی لکھاری شامل تھے، جنہیں پہلے پہل تو ایک بچے کا یوں ہم عمروں کی طرح پکارنا ناگوار گزرا لیکن دھیرے دھیرے وہ اس کا لطف اٹھانے لگے۔

بلکہ عرصہ دراز بعد جب وہ سفر کے قابل نہ رہے تو لوک ورثہ میں عکسی کے آفس میں آن کر بیٹھ جاتے اور گپ شپ لگاتے۔

! عجیب باپ تھے مفتی جی اوکھے تے وکھرے

" لوگ اولاد کو 'آپ جناب' سکھاتے ہیں مفتی جی نے بقول عکسی "مجھے بد تمیز بنا دیا

اتنے بڑے بڑے دانشوروں، ریڈیو کے فنکاروں کے بیچ بچپن اور جوانی بتانے والے عکسی کی سوچ اور شخصیت میں بھی انہی بابوںؒ جیسی پختگی جھلکنے لگی۔ بلکہ جب ۱۹۶۵ میں لاہور ایم اے نفسیات کرنے گیے تو دو سال تک اشفاق احمد کے گھر ہی ڈیرہ ڈالے رکھا کہ ان سے گاڑھی چھنتی تھی۔

!! ابو سے زیادہ ابو کے ہمجولی کے یار تھے وہ

تخلیق کاروں کے ساتھ سیر سپاٹوں نے عکسی کے دل میں پاکستانی ثقافت کی محبت نے ایسا ڈول ڈالا جو ؒبعد میں لوک ورثہ کی شکل میں پورے پاکستان کی ثقافت کو بھر بھر لایا۔

مفتی جی کی زندگی ہمیشہ ہنگامہ خیز رہی۔ ادبی دنیا میں بھی ہر جانب خار ہی خار تھے ان کے لیے۔ مفتی جی کا انداز تحریر انوکھا اور اردو کے ٹھیکیداروں کے لیے زود ہضم نہ تھا۔ مفتی جی انگریزی مٰیں سوچتے، اپنی گھڑی ہوئی کی اصلاحات اور ڈکشن کا استعمال کرتے۔ جس پر مخصوص اجارہ دار قسم کی ادبی لابی کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو جاتیں۔

مفتی جی بھی ہٹ کے پکے نکلے، اپنی راہ لگے رہے جیسا چاہا لکھتے رہے آخر کار اپنی تخلیقات کے حسن اور ندرت کو منوا کر چھوڑا۔ ایک زمانہ ان کی تحریروں کا دیوانہ ہو گیاَ۔

پہلے پہل تو ان کی نفسیاتی کش مکش والی کہانیوں پر 'جنسی کہانیوں' کا لیبل بھی لگادیا کچھ کنوییں کے مینڈکوں نے۔ پھر جب دانا لوگوں نے سمجھایا کہ ہوش کے ناخن لو یہ تو خالص ادب ہے کرداروں کے اندر جھانکتا اترتا ہوا ایک الگ ذایقہ، اس کی مخالفت تمھیں آنے والے وقت میں جاہل ثابت کر دے گی۔

سو مخالفین کی چیخ وپکار دھیمی ہوتی گیی۔ اور مفتی جی کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔

مفتی گروپ

۲۰۰۰ میں، میں کراچی چلی گیی پانچ سال بعد واپس آیی تو شہر کی ادبی فضا بہت بدل چکی تھی۔

گروہ بندیوں کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر مسلک، برادری اور زبان کی بنیاد پر عجیب و غریب نظریات کی بھرمار تھی۔ کسی کو چڑھایا جارہا تھا تو کسی کو دیوار کے ساتھ لگایا جارہا تھا۔ جی حضوریوں کی پانچوں گھی میں تھیں۔ جب جہاں جی چاہتا اپنے مقاصد کی خاطر ادب کو آفاقی بنادیتے اور جہاں ضرورت پڑتی ادب میں لسانیت، مسلک اور کیی قسم کے تعصبات کو گھسیڑ دیتے۔

مفتی جی کے جانے کے بعد 'رابطہ' کا احیا کیا گیا۔ ان کے گھر کے اوپر والے حصے میں، جہاں عکسی مفتی رہتے تھے اجلاس ہوا۔ مفتی جی کی کمیہر کویی محسوس کر رہا تھا۔ سبھی کی پلکیں بھیگی ہویی تھیں۔ مشترکہ قرارداد کے تحت مجھے سیکرٹری اور منشایاد کو صدر چنا گیا۔ جبکہ عکسی مفتی سر پرست اعلی مقرر ہویے۔

زیادہ تر پرانے ہی ممبران تھے ایک آدھ نیا تھا لیکن یہ رابطہ دوبارہ پہلے کی طرح نہ بحال ہو سکا۔ ہوتا بھی کیسے؟ روح کے بغیر جسم کیسے کھڑا رہ سکتا ہے؟

!اب تو کیی پرانے سینیر ممبران بھی چلے گیے، رہے نام اللہ کا

اسی دوران ممتاز مفتی ٹرسٹ قایم کیا عکسی مفتی نے۔ جس میں ان کے گھرانے کے چند لوگ اور دو چار لکھاری بھی شامل تھے۔ مجھے بھی ممبر شپ دی گیی مگر بات پھر بھی نہ بنی۔ سب کے اپنے اپنے مقاصد اور اپنی اپنی بولیاں تھیں۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ مقناطیس جو لوہ چون کے ٹکڑوں کو ایک مرکز پر کھینچ لیتا تھا وہ اب موجود نہیں تھا

چند سال پہلے مفتی جی کی فیملی کے ایک نوجوان عمران مفتی نے عکسی مفتی اور ممتاز مفتی کے کچھ پرستاروں کے ساتھ مل کر فیس بک پر 'ممتاز مفتی گروپ' بنایا۔ اب اس گروپ کے ممبران کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ھے۔

سہیل تاج اس گروپ کو بڑی محنت اور محبت کے ساتھ چلا رہا ھے۔ ہر چند ماہ بعد کسی نہ کسی شہر میں سب مل جل کر اپنے خرچے پر ایک اکٹھ کرتے ھیں اور مفتی جی کے حوالے سے باتیں ہوتی ھیں۔ عکسی مفتی بطور خاص شامل ہوتے ھیں۔

!کسی درآمد شدہ ایجنڈے کے بغیر

صرف مفتی جی کی محبت کے شیرے میں لتھڑے ہوۓ لوگ۔ جن میں اکثریت ان نوجوانوں کی ہوتی ہے جو کبھی مفتی جی کو ملے ہی نہیں وہ ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ان کی زبانی جنھوں نے مفتی جی کو دیکھا اور سنا، ہے نا کمال؟

! جادووہ جو سر چڑھ کر بولے

سر گودھاوالی تقریب میں میں بھی شامل تھی۔اگلی تقریب میں مجھے ممتاز مفتی گولڈ میڈل ادبی خدمات کے سلسلے میں دیا گیا۔میری زندگی کا سب سے بڑااعزاز یہی ھے۔میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، مجھے یقین ہے مفتی جی کہیں آسمانوں سے یہ سب دیکھ کر مسکرا رہے ہوں گے۔

"شایید کہ رہے ہوں،"لے اہدے اچ رون آلی کیہڑی گل اے کڑییے ڈھول وجاتے ہس کھیڈ

ڈاکٹر ابدال بیلاکا دعوی ھے کہ مفتی جی اپنی پگڑی ان کے سر پر رکھ گیے ہیں، مجھے یقین نہیں آتا۔مفتی جی کو تو نمود نمایش سے چڑ تھی۔ان کی زندگی کا مشن ہی کچھ اور تھا۔انہوں نے تو خود اپنے سر پر کوئی پگڑی نہ باندھی تھی کبھی وہ تو خود کو چھپاتے پھرے وہ کسی کے سر پر کیا پگڑی رکھتے؟

سیکرٹ ایجنٹ

میں قدرت اللہ شہاب کو مفتی جی کے ہاں ملی تھی۔ ۱۹۸۵

مجھے یاد ہے اوایل سر دیوں کی خوشگوار شامیں تھیں۔ مفتی جی کے ہاں ایک تقریب تھی۔ گراموفون کے قریب والے صوفے پر شہاب صاحب عاجزی کے ساتھ سمٹے سے بیٹھے تھے۔ گورا رنگ جس میں ہلکی سی زردی کی آمیزش، سفید داڑھی سفید لباس ہلکا سا گرم کوٹ تھا یا سویٹر یاد نہیں اور اونی مفلر!۔

وہ خاموش سے، ماحول میں جذب بیٹھے تھے۔ سلام دعا ہوئی، میں خاموشی سے ایک جانب بیٹھ گیی۔ مفتی جی سے باتیں ہوتی رہیں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ لیکن مجھے مسلسل احساس رہا کہ کسی کی اثیری لہریں مجھ سے ٹکرا رہی ھیں

۔

میں 'لبیک' کے صفحے پلٹ رہی تھی'۔ کبھی چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے شہاب صاحب نظر آتے اور کبھی ایوب خان کے سیاسی مشیر کا چہرہ دکھایی دیتا۔ جو زیادہ بات نہ کرتے مگر جب پوچھا جاتا تو صدر کو بے خوفی کے ساتھ اپنی رایے دیتے نظر آتے۔

سوچ رہی تھی صوفے کے ایک کونے پر سمٹی ہویی یہ سادہ خاموش سی شخصیت کیا واقعی قدرت اللہ شہاب ہیں؟ کیا یہ دونوں ہستیاں وہی ہیں جن سے ملنے کی دعا 'لبیک' پڑھنے کے بعد شدت سے کی تھی؟

لگتا تھا کسی خواب میں موجود ہوں۔ سب کچھ غیر مریی سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس پہلی ملاقات کا کچھ عجیب نا قابل بیان سا اثر تھا مجھ پر جسے میں صرف محسوس کر سکتی ہوں آج بھی اسی توانایی کے ساتھ۔

شروع میں تو خاصی مرعوب رہی، کہاں میں ایک چھوٹی سی طالبہ، جس کے لیے دنیا ابھی ایک حیرت کدہ تھی اور !! کہاں شہابؒ صاحب کی ہمالیہ جیسی شخصیت، جن کے سامنے جانے کیسی کیسی دنیایوں کے راز افشا ہو چکے تھے

انہوں نے مجھے بہت توجہ دی۔ شفقت کی ایسی پھوار کہ میں اس میں بھیگنے لگی۔ مفتی جی اور وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کی ضد محسوس ہوتے تھے۔ مفتی جی اندر باہر سے گرجتے برستے شعلہ جوالہ !شہاب صاحب ٹھنڈی ٹھنڈی چمکیلی پھوار۔ ٹھنڈے ٹھار شعلے کی ابلتے ہویے آتش فشاں سے قربت سمجھ سے باہر تھی۔

مفتی جی سے میں اکثر اس بارے میں پوچھتی رہتی مگر وہ ہنس کر ٹال جاتے۔ کوپی کرنٹ ان دونوں کے درمیان اس طرح دوڑتا رہتا کہ بن کہے سنے بن سنے وہ دونوں ایک دوسرے سے مخاطب رہتے۔

یونیورسٹی میں تھی تو شوق چرایا کہ شہاب صاحب اور مفتی جی کو اپنے گھر مدعو کروں۔ مفتی جی سے چونکہ بے تکلفی تھی دوستی تھی، وہ ہم سب کی 'سہیلی' بھی تو تھے سو ان سے اس خواہش کا اظہار کیا۔

ہنس کر کہنے لگے، "دیکھو میں تو جہاں کھوگی بیماری کے باوجود آ جایوں گا۔ پر کڑیے شہاب نییں آوے گا اوہ "میرے گھر توں سوا کدرے نییں جاندا کرلے فون تے کرا لے عزت

ان کے لہجے میں ہنسی کے ساتھ ایک یقین بھی تھا۔

!مفتی جی کی بات چیت کا عام طور پر یہی انداز ہوا کرتا تھا شگفتہ، شرارتی اور دھانسو

میں ریسیور رکھ کر سوچ میں پڑگیی کہ اگر شہاب صاحب نے آنے سے انکار کر دیا تو؟

انکار کی صورت میں مایوسی سے بھی بچنا چاہتی تھی، انا کا غبارہ بھی اس زمانے میں خاصا پھولا رہتا تھا۔ مگر ہمت کی کہ شہاب صاحب کی خصوصی توجہ کا بھی مان تھا مجھے۔ فون گھمایا شہاب صاحب نے اٹھایا۔ سلام دعا کے بعد جی کڑا کر کے انہیں گھر آنے کی دعوت دی۔

'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مخصوص نرم لہجے میں جواب ملا، ''آپ دن اور وقت طے کر لیں ضرور آہوں گا

میری تو جیسے خوشی سے سانس رکنے لگی۔

ریسیور ہاتھ میں پکڑے پکڑے میں چلایی، ''امی امی شہابؒ صاحب ہمارے گھر آ رہے ہیں''۔

مجھے یقین ھے کہ فون کے دوسرے سرے پر ان کے چہرے پر مخصوص اجلی سی مسکراہٹ پھیل گیی ہو گی۔

چند لمحے خود کو سنبھالا، ان سے دن اور وقت طے ہو گیا۔

ایک سیکنڈ بھی ضایع کیے بغیر مفتی جی کو کال کی۔

''وہ چھوٹتے ہی بولے، ''ناں کہ دتی ناشہاب نے؟ ٹھنڈ پے گیی اے تینوں؟

''جی پے گیی اے ٹھنڈ او کہ رہے نیں منگل نوں ۴ بجے شامی

چند لمحے دوسری جانب گھمبیر سناٹا رہا پھر ان کی آواز آیی۔

'' کڑیے تیرے اچ کی چلتر اے؟ ہن مینوں وی آنا پیے گا ''

آج بھی مفتی جی کی وہ حیرت، وہ لہجہ یاد کر کے میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے

دو دن بعد وہ دونوں ہستیاں ہمارے ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھیں۔

ایسی خوشی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔

میری امی کی عادت ہے ملنے جلنے والوں کے سامنے میرے مزاج کو درست کرنے کی اپیل کرتے رہنا۔ کہ میں شروع سے ہی تھوڑی الگ اور اپنی من مانی کرنے والی ہوں۔ سو وہ حسب دستور ان دونوں سے بھی مجھے دنیاداری سکھانے کی اپیل کرنے میں مصروف تھیں۔

سادہ سی خاتون کیا سمجھتیں کہ حقیقی تخلیق کار سبھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اپنی ہی دنیا میں رہنے والے، تھوڑے مشکل سے تھوڑے عجیب و غریب مگر منافقت سے دور! جسے دنیا مصلحت پسندی کہتی ہے

وہ میری شکایت کرنے بیٹھیں بھی تو کن سے؟ مفتی جی تو مسکراتے رہے چمکتی آنکھوں کے ساتھ پھر کہنے لگے،

یہ لڑکی آپ کے بس کی چیز نہیں اسے کرنے دیں جو کرتی ھے اپنی مرضی پر چلنے دیں"۔ "

شہاب صاحب نے کافی دیر میری امی کی گفتگو صبر کے ساتھ سنی اور نہایت سنجیدگی سے کہا، "مسز مبشر آپ کی بیٹی " ایک ہیرا ھے اس کی قدر کریں

میں تو یہ سن کر بادلوں میں تیرنے لگی۔ امی شایید مایوس ہو گییں کہ اس باغی لڑکی کے سدھرنے کی اب کویی امید باقی نہیں رہی۔ انہیں قوی بھروسہ تھا کہ یہ دونوں انسان مجھے سدھار سکتے ہیں مگر ان کی آخری آس بھی اس دن دم توڑ گیی تھی۔

ڈیڈی مسکرانے لگے کہ انہوں نے میری باگیں کبھی موڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر میری حوصلہ افزایی کرتے رہے ہمیشہ۔ امی کی مایوسی دیکھ کر مفتی جی نے مسکرا کر چایے کا کپ منہ سے لگا لیا تھا۔

وقت گزرتا رہا تبھی زندگی کی دھوپ نے جلا جلا کر سمجھایا کہ ہیرا بننے کے لیے کیسی کیسی تپش سہنا پڑتی ھے۔ معلوم نہیں شہابؒ صاحب نے جسے ہیرا کہا تھا وہ راکھ ہو گیی یا کندن بنی؟

ہماری ملاقاتیں جاری رہیں کبھی مفتی جی کے ہاں کبھی ایف سیون میں ان کی بہن محمودہ آنٹی کے گھر جہاں وہ رہتے تھے۔ حیرت ہے نا کہ اپنے وقت کا ٹاپ بیوروکریٹ، سابق سفیر اور ایوب خان کا سیاسی مشیر جس کا ایک ہی بیٹا تھا ۔ اس کا نہ کویی بنک بیلنس تھا اور نہ رہنے کو چھت۔

ثاقب شہاب ڈاکٹری کر رہا تھا ان دنوں۔ محمودہ آنٹی کافی ضعیف مگر بہت ملنسار خاتون تھیں ان کے بیٹے بلال اور بہو فوزیہ بھی ڈاکٹر تھے۔

شہاب صاحب سے وہاں ملنے محض چند لوگ ہی جاتے کیونکہ مزاج کے لحاظ سے وہ گوشہ نشین تھے۔ ان کی خاص شفقت کہ میں وہاں ان سے ملنے ان کی لائبریری میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے چلی جاتی۔ ہلکی پھلکی باتیں زندگی کی چلتی رہتیں، ادب اور ملکی حالات بھی زیر بحث آتے۔

مجھے فخر ھے کہ 'شہاب نامہ' کے کئی صفحات میرے سامنے انہوں نے لکھے، کبھی کبھار کچھ حصے مجھے سنایے بھی۔ کتاب ان کی وفات کے بعد چھپی ان کی وصیت کے مطابق ثاقب نے کتاب مجھے پہنچایی کہ بابا نے تاکید کی تھی کہ شہابہ کو پہلی پہلی کاپیوں میں سے 'شہاب نامہ' دینا ھے۔

یااللہ مجھ میں ایسا کویی پن نہ تھا پھر بھی اتنے خاص بندوں کی توجہ مجھے ملی؟ شاید اس راہ پر ڈالنا تھا جس پر آج بھی چل رہی ہوں اپنی تمام تر خامیوں سمیت !!

وہ ھے پاکستان سے بے تحاشہ محبت! اس مٹی سے عشق !

ایک بار شہاب صاحب کے پاس بیٹھی تھی بات چل رہی تھی وسوسوں کی منفی خیالات کی کہ ان پر کیسے قابو پایا جایے؟

انہوں نے بے حد خوبصورت بات کی جو دل پر نقش ہے،

"اپنے دل کو چھلنی بنالو جیسا بھی خیال آیے آنے دو گزر جانے دو، مگر منفی خیال رکنے نہ پایے۔ منفی خیال پر نہ شرمندہ ہونے کی ضرورت ھے نہ کسی احساس جرم کی۔ خیال جب دل میں بیٹھ کر منفی عمل پر اکساتا رہے تو الرٹ ہو جایو"

کچھ دعایں اور اسم اللہ بھی بتایا کرتے تھے پڑھنے کو مشورے کے انداز میں۔ جانے ان کا مقام کیا تھا کتنا بڑا تھا روحانیت کی دنیا میں؟ مگر انہیں اس ایک سال کے دوران ہمیشہ انکساری اور سادگی کی تصویر بنے دیکھا۔

"اکثر دہرایا کرتے، "ہمیشہ خاتمہ باالایمان اور خاتمہ باالخیر کی دعا مانگا کریں

میں نے ایک بار اپنی کم فہمی کے سبب سوال کیا،

"ہم تو مسلمان ہیں تو پھر خاتمہ باالایمان کی دعا کی کیا ضرورت ہے؟"

ان کا چہرہ عجیب سے تاثر سے اٹ گیا،

ایمان صرف وہ نہیں جو ہم سمجھتے ہیں عام طور پر، ایمان کی بہت ساری جہتیں ہیں۔ میں نے کیی لوگوں کو آخری "عمر میں اللہ سے منکر ہوتے بھی دیکھا ہے۔"

میں تو ایک ایک لمحہ ایک ایک لفظ اپنے اندر جذب کرتی رہتی۔ مجھے میری اوقات سے زیادہ دیا میرے مولا نے۔ ان دونوں ادبی وروحانی سرچشموں کے قریب بیٹھنے سے کچھ نہ کچھ تو بھیگنا تھا مجھے بھی۔ میرے تنگ دامن کے لیے !!تو صرف چند چھینٹے بھی بہت تھے

ابھی تو بہت تشنگی باقی تھی، ان دونوں جیسا خالص کندن ابھی تک کویی نہ ملا۔ ملتا بھی کہاں اور کیسے؟

یہاں تو اللہ، رسول، قرآن اور پاکستان کے نام کے بیوپاری، اپنی اپنی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں۔ لیکن پھر بھی اوپر !والے کا کرم ہے پاکستان کا معجزہ ہے کہ وہ دیے جارہاہے جھولیاں بھر بھر

بس ایک سال تک علم کے اس سمندر سے فیضیاب ہوئی پھر وہ چلے گیے اپنی محبوب بیوی ڈاکٹر عفت کے پاس، ! اپنے ابدی گھر

میری زندگی میں ایک اور قیمتی ترین سال شامل ہو گیا۔ ایسا ہوتا ہے، کوئی چند لمحے، کسی کا ایک جملہ، کسی کی ایک نگاہ قسمت بدل کر رکھ دیتی ہے۔ لیکن ان معاملات کو دل اور روح کی آنکھ سے دیکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں دنیا میں لت پت لوگ نہیں۔

شہاب نامہ 'کا ایک باب 'آج عفت مر گیی' انہوں نے اپنی بیگم کی وفات پر لکھا تھا جسے ان سے ملنے سے پہلے میں ' پڑھ کر میں بہت روئی تھی۔

جولائی کا مہینہ ۱۹۸۶ شام پانچ بجے فون آیا کہنے لگے "بیٹا آج آسکتی ہیں آپ"؟

میں نے پوچھا، "خیریت؟ کوئی ضروری بات ہے"؟

" کہنے لگے، "یونہی ملنا چاہ رہا تھا

میں سارا دن مختلف کاموں کے سلسلے میں ڈرائیو کرتی گھومتی پھرتی خاصی تھک چکی تھی جولائی کا مہینہ تھا اور گرمی سے ویسے بھی میری جان جاتی ہے سو اگلے دن ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اگرچہ مجھے افسوس بھی تھا ان کی بات ٹالنے کا۔

ان کی آواز میں ہلکی سی اداسی تھی۔

کہنے لگے، "اچھا جیسے آپ کی مرضی۔ بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے قلم میں بہت طاقت ہے اسے کبھی ہاتھ سے " نہ چھوڑیے گا

ان کا انداز تخاطب بے حد شایستہ تھا ہر کسی سے نرم لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان میں اپنے خاندانی پس منظر اور عہدوں کے حوالے سے کوئی خو بو نہ تھی۔ ان کے والد عبداللہ صاحب جموں کشمیر کے گورنر رہ چکے تھے لیکن

انتہایی سادہ اور ایمان دار انسان۔ خود شہاب صاحب آزادی سے قبل پہلے مسلمان آیی سی ایس آفیسر تھے پورے ہندوستان میں۔ لیکن عجز اور سادگی کا پیکر!

صبح اذان کے وقت فوزیہ، ان کے بھانجے بلال کی بیوی کا فون آیا کہ شہاب صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔

میں ساکت سی رہ گیی ایک آنسو بھی نہ گرا۔

اسی وقت گاڑی نکالی اور محمودہ آنٹی کے گھر پہنچی۔ راستہ بھر سوچتی رہی گلہ کرتی رہی شہاب صاحب سے کہ کھل کر کل بتادیتے مجھے کہ آپ نے تیاری کر لی ہے۔ میں اسی وقت آجاتی حسرت تو نہ رہتی۔

میں ناسمجھ کیسے سمجھ پاتی آپ کا پیغام؟ اتنی عقل کہاں تھی؟ کاش آپ کے کل شام والے فون کی حقیقت جان لیتی کاش!!

یہ پچھتاوا آج بھی میرے ساتھ ہے۔

پاکستان بھر سے لکھاری، ان کے خاندان کے لوگ اور عقیدت مند پہنچ رہے تھے۔

میں ایک ٹک اس چہرے کو دیکھ رہی تھی جس پر بے حد معصوم سی مسکراہٹ چسپاں تھی۔ جو بڑے بڑے عہدوں پر رہنے کے باوجود سوایے اپنے اکلوتے بیٹے کے کویی بنک بیلنس کویی جاییداد نہیں چھوڑ کر جا رہے تھے۔

ان کا کردار ان کا فیض اور ان کے پاکستان پر احسانات ہی ان کے عقیدت مندوں کو یاد رہیں گے۔ بدقسمتی کہ بہت سارے پاکستانیوں کو تو ان کی عظمت کا اندازہ بھی نہیں

یہ بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے پاکستان کو کیی سال پہلے بچانے کی خاطر کتنی بڑی بڑی سزاییں کاٹیں۔ استعماری قوتوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟۔ وہ سب تلخ حقایق ان کے قریبی ساتھیوں کو معلوم تھے جن کی تفصیلات وہ اپنے ساتھ ہی لے گیے۔

من حیث القوم ویسے بھی ہم محسنوں کو بھولنے والی بلکہ محسن کش قوم ہیں۔ ہم بانس پر صرف غداروں، مکاروں اور فریبیوں کو چڑھاتے اور انہی کے نعرے لگاتے ہیں۔ ملک کو لوٹ کر باہر جاییداد یں بنانے والوں کا پراپیگنڈہ کرتے، عظمتوں کے گن گاتے اور تاریخ کو مسخ کرتے ہیں۔

تبھی تمامتر انسانی وقدرتی وسایل اور ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود ہمارے ہاتھوں میں کاسہ گدایی ہے اور ہم اپنے گھر کے فیصلوں اور بقا کے لیے دوسروں کی جانب دیکھنے پر مجبور ہیں۔

۔ ہمیں خواب غفلت سے اب کویی بہت بڑا جھٹکا ہی جگایے گا کہ ہم پاکستان کے قیام کے مقاصد اور اس کی خاطر دیی گیی قربانیوں کو بھول چکے ہیں۔

ہاں تو میں کہاں نکل گیی تھی شہاب صاحب کے چہرے کو دیکھتے دیکھتے۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی جاگ جاییں گے اس گہری نیند سے۔ ان کا سفید کرتے پاجامے میں ملبوس نفیس ساوجود اکثر نجانے کیوں غیر مریی سا لگتا مجھے؟ روشن آنکھیں اندر تک کھبتی محسوس ہوتیں،

آب ان آنکھوں کو پلکوں اور پپوٹوں نے چھپا رکھا تھا۔ اسی لمحے اچانک ہی ضبط کے بندھن ٹوٹ گیے اور میں گڈی آپی سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

مٰیں اس قابل تو نہ تھی کہ ان کی لایبریری میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی۔۔ شہاب نامہ کے باب انہیں لکھتے دیکھتی، کاٹتے چھانٹتے دیکھتی اور پڑھتی !

محمودہ آنٹی اور ان کے بچے بھی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے کہ مجھ خام مٹی پر ان مشاق کوزہ گروں یعنی شہاب صاحب اور مفتی جی کی خاص توجہ تھی۔

مفتی جی بھی کہا کرتے تھےِ ''میں تیس سال سے شہاب کے ساتھ ہوں میں تو کوکڑو کا کوکڑو ہی رہا۔ تم کیسے اتنی جلدی اس کے زیر اثر آ گییں؟''

میں جانتی ہوں وہ یہ باتیں خود کو کیموفلاج کرنے کو کہتے تھے۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کو چھپانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ کم فہم لوگوں کے اس الزام کے برعکس کہ مفتی جی اور قدرت اللہ شہاب ایک دوسرے کو پروموٹ کرتے تھے۔

مجھے تو خود پتہ نہ چلا کہ کیسے ان دونوں ہستیوں نے میری قلبی ماہیت بدلی یا اسے نکھارا؟ میری خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود کیسے میرے اندر رب کو یوں انڈیل گیے کہ ہزار سال کی عبادت سے بھی شاید ممکن نہ ھوتا۔ ان دونوں کا اسم تھا یا سحر جو سر چڑھ کر بولتا تھا۔

بے چارے سطحی دماغوں کو ان باتوں کی کیا خبر؟

میں کتنی خوش قسمت ہوں جو پاس بیٹھنے سے زرا سی بھیگ گیی تھی۔ فیض اور سرشاری کی چند بوندیں مجھ پر پڑ گییں۔ وہ دونوں تو محبت اور انسانیت کے وہ سر چشمے تھے جن کے منبع کا پتہ چلتا تھا نہ ہی بہاو کا۔۔

شہاب صاحب کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے میں ان کی لائبریری میں بیٹھی حسب معمول لوگوں کی منافقتوں پر جھنجھلا رہی تھی، اب بھی کبھی کبھار جھنجھلاتی ہوں۔ وہ بڑے سکون سے سنتے رہے مخصوص تاثرات کے ساتھ،

''میں نے کہا، ''جی چاہتا ھے سب کرپٹ لوگوں کی شوٹ کر دوں

!! عمر ہی ایسی تھی شدت ہی شدت

دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے،

آپ کے شوٹ کرنے سے کیا شیطان مر جایے گا؟ غصہ کی بجایے ایسے لوگوں پر ترس کھایا کریں۔ یہ بے " چارے تو محروم، قابل ترس لوگ ہوتے ہیں نیکی کرنے کی سکت سے قاصر! انہیں ہمدردی اور دعا کی ضرورت "ہوتی ہے

میں ان کے روشن چہرے کو دیکھتی رہ گیی۔ شروع میں وہ میرے لیے ایک نہاٰت نفیس اور نیک انسان تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربات و مشاہدات کے بعد محسوس ہوا کہ بات کچھ اور ہے، بہت بڑی، میری !! عقل کی حدود و قیود سے بہت آگے

! کتنی سوغاتیں دے گیے مجھے یادوں کی صورت

کوکڑو

مفتی جی کی زندگی میں اتنے اتار چڑھاو، اتنی پٹخنیاں شاید اسی لیے تھیں کہ قدرت انہیں کسی بڑے کام کے لیے تیار کر رہی تھی۔

پاکستان بننے سے پہلے کی ساتھیوں میں احمد بشہیر اور اشفاق احمد تھے۔ یہ لوگ اکٹھے بمبیی میں تھے۔ اس زمانے کی دوستی آخر تک چلتی رہی کیی نظریاتی اختلافات کے باوجود بھی۔

مفتی جی لاہور آیے ہویے تھے اس وقت جب انبالے اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے خلاف غارت گری اور تشدد کے واقعات شروع ہویے۔

اس وقت کی یادیں بیان کرتے ہویے مفتی جی کی آنکھوں میں ایک ایسا تاثر ایک ایسی روشنی ہوتی تھی کہ بیان سے باہر۔

ایک دن میں ان سے ملنے آیی تو وہ حسب معمول ڈراییگ روم کے نمدے پر بیٹھے اپنی کتاب پر کام کر رہے تھے۔ شکر ہے کہ کویی اور ملاقاتی نہ تھا اس دن۔ یونہی بات چلی تو شایید اس دن موڈ میں تھے یادوں کی بارات کے ساتھ چل پڑے، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے

جب انہیں انبالے میں فسادات کی اطلاع ملی تو وہ ٹرک لے کر اپنے گھر والوں کو وہاں سے نکالنے پہنچے کہنے لگے،

میں آج تک حیران ہوں کہ میں ان حالات میں لاہور سے ٹرک لے کر کیسے گیا اور کیسے اپنے گھر والوں کو ''
'' بحفاظت وہاں سے نکال لایا

اس وقت تو ٹرینیں بھی پاکستان کی جانب لاشوں اور خون سے بھری پہنچتی تھی ''میں نے کہا ''

آپ کیسے سب کو بچا کر لے آیے ''؟ ''

مفتی جی نے پہلو بدلا کشن کو سیدھا کیا اور اس پر کہنی ٹیک کر کہیں دور خلا میں دیکھتے ہوے بولے،

'' رومی ٹوپی والا ہمیں بچا تا رہا ''

رومی ٹوپی والا ''؟ میرا تجسس عروج پر تھا ''

ہاں رومی ٹوپی والا میں اسے نہیں جانتا پر وہ میرے ساتھ ساتھ رہا زندگی میں مجھے ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کے بعد ''
'' بھی بچایا اس نے

مفتی جی کسی اور ہی ٹرانس میں تھے۔ ان کی آنکھوں کی جانب دیکھا نہیں جا رہا تھا ایسی چمک تھی کہ میری نظریں چندھیا رہی تھیں۔

''میری ماں نے بڑی کوشش کی مجھے سیدھے راستے پر ڈالنے کی مگر میں سدا کا کوڑھ، کچھ نہ ہو سکا''

خیر یہ تو آپ نہ کہیں آپ تو جانے اب کن منزلوں کو طے کر چکے ہیں جو عام انسان کی عقل سمجھنے سے بھی قاصر ''
''ہے

میری یہ بات سن کر انہیں جھٹکا سا لگا ایکدم الرٹ ہو گیے،

''کڑیے اللہ دا واسطہ ای مینوں کویی بزرگ شزرگ نہ سمجھیں ''

مگر مجھے جو نظر آ چکا تھا وہ کیسے بھول جایوں؟ میں نے سوچا

پھر کہا، ''سنا ہے کہ قدرت جب کسی سے کویی خاص کام لینا چاہتی ہے تو اسے اسی حساب سے آزماتی ہے، تیار کرتی
''ہے جیسے گوریلا ٹرینگ اور عام فوجی ٹرینگ میں فرق ہوتا ہے

مفتی جی نے مجھے بغور دیکھا، ''شہابہ توں گلاں بہت کرنی ایں شہاب نے پتہ نیں تینوں میرے بارے اچ کی پٹھا
'' سیدھا دسیا اے

میں نے کہا، ''وہ کب کھلتے تھے کسی پر؟ آپ پر تیس سال میں پوری طرح عیاں نہ ہویے میری کیا حیثیت تھی کہ
''ایک سال میں ہی کچھ بتا دیتے

مفتی جی نے مجھے کھوجنے والی نظروں سے دیکھا،

'' ہوں پتہ نہیں شہاب کون تھا کیا تھا پر میری مت مار گیا میری ماں نے بھی بڑے جتن کیے تھے مگر کچھ نہ بنا ''

مطلب ''؟''

وہ سادہ مسلمان عورت میری دہریت سے خوف زدہ مجھے دوزخ کی آگ سے بچانا چاہتی تھی پاکستان آنے سے ''
''پہلے جانے کس کس بابے کے پاس لیے پھری مجھے۔

مفتی جی اب ماضی کے آیینے کے سامنے کھڑے تھے میں نے چپ چاپ ان کے عکس کو دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ خود سے ہم کلام تھے،

ماں کے ایک بزرگ تھے حاجی صاحب رفیع الدین بلی ماروں میں رہتے تھے۔ ماں نے منت ترلے اور واسطے ڈال ''
کر مجھے وہاں بھیجا کہ ان کی بیعت کر لوں ان کی 'چشتیہ آنکھ' نے خاصے ہایی ولٹیج کا کرنٹ بھی مارا، مگر کچھ عرصے
بعد میں وہی کوکڑو کا کوکڑو!! کوکڑو کا مطلب سمجھتی ہونا''؟

انہوں نے یکدم مجھ سے سوال کیا

جی دال کا وہ دانہ جو کسی تیز تر آگ پر دیر تک رکھنے پر بھی نہ گلے''میں نے جواب دیا ''

پھر ماں مجھے پگ والے بابے کے پاس لے گیی ۱۹۴۵ کی بات ہے یہ۔ اس وقت میں زندگی کے بدترین المیے سے ''
گزر چکا تھا خاندان کی عزت خاک میں ملا چکا تھا۔ ان کے پاس بھی کویی طاقت ضرور تھی۔ انہوں نے سارا ماضی
سامنے رکھ دیا پوری تصویر کھینچ دی۔ میں تو سٹپٹا گیا۔ ماں نے کہا اس کے لیے دعا کریں انہوں نے کورا جواب دے
''دیا کہ ہم دعا کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ اللہ جانے اور اس کے کام

پھر''؟میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی ''

پھر کیا ہونا تھا بس ایسے ہی لور لور پھرتا رہا مگر ایک بے چینی تھی اندر ہی اندر آگ لگی تھی بھڑکن تھی کہ جلائے جارہی تھی"

انہوں نے ایک ہلکی سی 'ہائے' کے ساتھ پہلو بدلا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گیے۔ میں نے کہا،

"آپ تھک گیے ہیں تو آرام کرلیں باقی پھر کبھی باتیں کریں گے" حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بس سناتے جاییں اور میں سنتی رہوں۔

انہوں نے میری سوچ پڑھ لی جیسے مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے،

"شہابہ مروت اچ وی جھوٹ نہ بولیا کر تیرا جھوٹ صاف پھڑیا جاندا اے"

میں کھسیانی سی ہو کر ہنس پڑی۔ وہ دلوں کے آر پار بھی دیکھ لیتے تھے ان کہی سن لیتے تھے کیا کہتی میں؟

وہ دوبارہ گویا ہوئے شاید سنانے کے موڈ میں تھے۔

"ویسے ایک بات ہے شہابہ میں اس زمانے میں جتنے بھی بابوں سے ملا سب میں ایک چیز مشترک تھی"

"وہ کیا؟"

اصلی بابے یہی کہتے ہیں کہ اللہ کے کاموں میں کوی دخل نہیں دے سکتا وہ جو چاہے جب چاہے کرے، اور ایمان" آنکھیں کھول کر نہیں آنکھیں بند کر کے ملتا ہے۔ بہت زیادہ شکوک اور سوال وسوسے پیدا کر کے راہ سے بھٹکا دیتے ہیں۔ مجھے بھی فرایڈ اور دوسرے کی مغربی دانشوروں نے شک کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ پر آج خود ان کے سائنس دان ان کے مفکر وہی کچھ اسلام میں دیکھ رہے ہیں قرآن ان کے سوالوں کا جواب دے رہا ہے اور وہ "ششدر ہیں

"آپ نے پہلے قرآن کبھی نہیں پڑھا تھا؟"

"انہوں نے نفی میں اپنا سفید بالوں بھرا سر ہلایا،

"پگ والے بابا نے کہا تھا کہ پہاڑیوں کی طرف چلے جایو وہیں تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو گا۔

پہاڑیوں کی طرف؟ مطلب "میری حیرت اور پیاس بڑھتی جا رہی تھی "

"! اسلام آباد، باقی تو جو ہوا سو ہوا لیکن ایسی ایسی پٹخنیاں دیں یہاں کے بابوں نے مجھے کہ پوچھو نہ توبہ "

پھر انہوں نے ایک ہلکی سی 'ہایے' کے ساتھ پہلو بدلا تو امی جی چایے کا پوچھنے آ گییں عین اسی لمحے۔

مفتی جی کی قسمت کہ لفظ 'ہایے' انہوں نے دروازے میں ہی سن لیا تھا سو بگڑنے لگیں،

اپنی صحت کا ستیاناس کر لیا ہے تمہارے مفتی جی نے نہ آرام نہ سونا نہ وقت پر کھانا پینا اور ساتھ مجھے بھی پریشان کرتے ہیں"۔

میں نے بھی نشت پھر کسی اور دن پر ملتوی کی۔ بڑی مشکل سے سجھا بجھا کر مفتی جی کو ان کے کمرے میں پہنچایا۔ امی جی نے چایے پر روک لیا زبر دستی۔ ہم دونوں نے لاونج میں بیٹھ کر چایے پی۔

وہ مفتی جی کی صحت کے بارے بہت پریشان تھیں کیونکہ شہاب صاحب کے جانے کے بعد مفتی جی جیسے بے سہارا سے لگتے تھے۔ ان کی پریشانی اور بیماری سے امی جی اپنی جگہ پریشان تھیں۔ مجھ سے ان کا بھی بہت پیار تھا۔ بیٹیوں کی طرح مجھ سے کبھی کبھار دکھ سکھ بانٹ لیتیں کہ تینوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔

کافی عرصہ مفتی جی کھویے کھویے سے اداس نظر آتے رہے پھر سنبھلنے لگے۔ دھیرے دھیرے 'رابطہ' اور حلقہ کی مصروفیات میں اپنا غم غلط کرنے لگے۔ لیکن ان کے مزاج آشنا ان کی ہنسی، ان کی باتوں میں ایک واضح فرق محسوس کر رہے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے ان کے وجود کا کویی حصہ کھو گیا ھے۔ شایید اس لیے کہ شہاب صاحب ہی وہ واحد ہستی تھے جنہوں نے مفتی جی کی قلبی ماہیت بدلی، وہی ان کے راز داں بھی تھے۔

پہلے والے سارے بابے جو مفتی جی کی زندگی میں آیے شایید وہ محض سنگ میل تھے، نشان منزل شہاب صاحب تھے اور منزل تھی اللہ اور اس کا رسول ﷺ۔

جانے کیسے کیسے بگولوں سے گزرے کس کس طرح ان کی ذات کو پھینٹا گیا، دھنکا گیا اور صفایی ستھرایی کے بعد ہیڈ ماسٹر کے حضور پیش کیا گیا۔

یہ ہیڈ ماسٹر شہاب صاحب تھے جنھوں نے بڑے پیار سے مزید نتھار کر مفتی جی کو آخر وہاں پہنچا دیا جہاں سے وہ بھاگتے تھے مفرور تھے۔ مفتی جی اپنی رضا سے قید ہوے اپنی پھولوں سی بیڑیاں اٹھائیں اور پایوں میں پہن لیں، پھر ان کا من دائیمی دھمال میں مگن ہو گیا۔

مفتی جی کا بنیادی مسلہ عرصہ دراز تک یہی رہا کہ وہ بابوں سے کسی حد تک متاثر ہوتے لیکن بھروبی فلاسفر اور دانشور ہنٹر لے کر کھڑے ہو جاتے۔ عقل اور شک کی راہ دکھاتے۔ بابا جو کہتا، فلاسفر اسے جھٹلا دیتا، جو دانشور کہتا بابا اسے بکواس قرار دے دیتا۔

چونکہ مفتی جی اس زمانے میں دانشوروں اور نفسیات دانوں سے متاثر تھے وہ سمجھتے تھے سائنس اور روحانیت دو الگ الگ راستے ہیں۔ مفتی جی مذہب کو نہ کھنگالتے تھے نہ مذہبی رسوم سے واقف تھے۔

سو ایک ہی جانب بڑھتے چلے گیے۔ بابوں سے واسطہ پڑا تو بوکھلا گیے۔ بہت کٹھن کام تھا ایک عقل والے کے لیے آنکھیں بند کر کے انجان پگڈنڈی پر چلنا، اپنے اندر رچایو سے سجایے ہویے مظبوط بتوں کو توڑنا۔ ان کا ذہن بابوں کی باتوں کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو جاتا بار بار۔

مگر بابوں نے بھی اندر موجود جوالا مکھی کو دیکھ لیا تھا۔ سو ایک بابے سے بھاگتے تو دوسرا راستہ روک لیتا۔

قصور مفتی جی کا نہیں تھا اس معاشرے کا ہے جہاں انہیں کیا ہماری اکثریت کو بچپن ہی سے گھر، سکول، مسجد ہر جگہ اللہ سے صرف ڈرایا جاتا ھے۔ اللہ کی وہی چند صفات جو سزا سے متعلق ہیں دہرائی جاتی ہیں۔ اتنا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اللہ کے غضب کا، کہ اللہ سے ہم دور بھاگنے لگتے ہیں۔

حالانکہ یہ سب کچھ اپنی سہولت کی خاطر کیا جاتا ہے کبھی سادگی میں اور کبھی مکاری سے۔ کیونکہ خوفزدہ وجود سہمے رہتے ہیں سر نہیں اٹھاتے سوال نہیں کرتے، سوچ کے دروازے بند کر لیتے ہیں، کلی طور پر بند کر کے آنکھوں پر کھوپے چڑھا لیتے ہیں۔

اللہ کا وہ روپ جو عملی طور پر حاوی ہے یعنی 'غفور الرحیم' وہ لوگ بتانا بھول جاتے ہیں شایید یا ان کے پاس خود کسی سوال کا جواب نہیں ہوتا !

اللہ سے دور بھگا دیا جاتا ھے ناپختہ ذہنوں کو۔ سو وہ اللہ کے تکلیف دہ خیال کو جھٹلانے میں ہی سکھی رہتے ہیں، برٹرینڈ رسل، ڈارون اور ان جیسوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ جو شک کرنا سکھاتے ہیں، بڑی پر کشش دلیلوں کے ساتھ بہت دلچسپ انداز میں۔

انسانی ذہن میں تجسس کو ابھارتے ہیں، مہم جوئی کی دعوت بہت اچھی لگتی ہے سو لوگ مذہب کو ایک بھاری پتھر سمجھ کر پرے ہو جاتے ہیں۔

اللہ میاں کے خود ساختہ ٹھیکیداروں نے اللہ میاں اور اس کے سیدھے سادے احکامات کو خوفناک بنا کر انسانوں کو ڈرا دیا۔ جیسے کوئی راشی اسسٹنٹ بڑے صاحب کو ہوا بنا کر ضرورت مندوں کو ڈراتا اور اپنی اہمیت بڑھاتا رہتا ہے۔

مفتی جی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ گھر باہر، اللہ میاں بس ایک سزا دینے والے ہیڈ ماسٹر بنے رہے ان کے لیے۔ بلکہ وہ الرجک ہو گیے اللہ سے بدکنے لگے۔ مذہب سے بے زاری نے سیکولرازم کا راستہ دکھایا۔ چمکیلے الفاظ نے مذہب کو ایک وقتی تسلی ثابت کر دیا۔

مگر ساتھ ہی ساتھ مفتی جی کی پیاس بھی بڑھتی گیی حقیقیت کو جاننے کی، پڑھتے گیے کنفیوز ہوتے گیے۔ کیونکہ اس زمانے میں انگریز اور ہندو دانشوروں، فلاسفروں، اور مورخین کی کتابیں ہر طرف موجود تھیں، دوسری جانب کوئی تشفی دینے والا نہ تھا، تجسس کے مارے مفتی جی کو اللہ میاں ہاتھ میں مولا بخش لیے ڈنڈا تھامے کھڑا نظر آتا تھا، سو انہی دانشوروں کے لکھے ہوئے میں مفتی جی کو پناہ ڈھونڈنا پڑی۔

سچ کی طلب سچی ہو تو کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ھے۔

مفتی جی کو بھی عزیز ملک مل گیے۔ جنہوں نے انہیں بابوں کی پٹڑی پر چڑھا دیا۔ اگر چہ بابوں والا سلسلہ پاکستان بننے سے پہلے شروع ہو چکا تھا مگر وقفے آتے رہے، مفتی جی بار بار بدکتے رہے۔

پاکستان کے قیام سے پہلے پگ والا بابا کہتا ہے کہ جایو پہاڑوں کی طرف رومی ٹوپی والا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

ایک رومی ٹوپی والا امر تسر کے چوک پر مفتی جی کے ٹرک کو گزرنے دیتا ھے جبکہ ہندو اور سکھ پاکستان جانے والوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ بچ کر گزرنے کی صفر فی صد بھی امید نہ تھی۔

مفتی جی ان واقعات کو کبھی کبھار بڑی حیرت سے سناتے۔ انہیں حیرانی یہ تھی کہ ان کی بیگم جو کہ ایمن آباد کے شیخوں میں سے تھیں اور بابوں کو نہیں مانتی تھیں ایک روز صبح کہنے لگیں،

مجھے خواب میں کسی نے بتایا ہے کہ تمہارے خاوند کا پہلا بابا غلط تھا۔ جو بابا اب انہوں نے اپنایا ہے وہ صحیح ہے اور " "ایک رومی ٹوپی والا نظر آیا مجھے یہ کون ہے رومی ٹوپی والا؟

مفتی جی ماضی میں جھانکتے ہوئے بولے،

میرا تو دماغ بھک سے اڑ گیا کیونکہ انہی دنوں عزیز ملک مجھے جنوں والے بابا سے سائیں اللہ بخش قلندری کی " " جانب لے گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ رومی ٹوپی والا کون ہے اور کیوں میرا پیچھا کر رہا ہے؟

پتہ چلا اس رومی ٹوپی والے کا؟" میرے سوال کا جواب نہ ملا، میں نے دوبارہ پوچھا، "

یہ عزیز ملک کون تھے"؟ "

ایک لکھاری تھا پنڈی کا اندر سے وہ بھی بابا ہی تھا مرد قلندر سائیں اللہ بخش کتاب بھی لکھی تھی اس نے اچھی ''
تھی ادبی انگ میں لکھی ہوئی۔ سائیں کی پنجابی نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان نظموں میں پاکستان کے عروج اور شان کا
'' ذکر ہے جو اس ملک کو ملنے والا ہے بزرگوں کے زریعے۔ سائیں کی زندگی کے بارے میں خاصی معلومات ہیں

آپ نے پڑھی وہ کتاب''؟ مجھے انہونی سی محسوس ہوئی ''

مفتی جی کھوئے کھوئے سے بولے،

ہاں پڑھی تھی تھوڑا مرعوب بھی ہوا مگر وہی کوکڑو میرے اندر کا پھر سامنے آگیا۔ مجھے چڑ ہونے لگی کہ یہ ''
''بزرگ یہ بابے بھلا مجھ سے کیا چاہتے ہیں میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟

مفتی جی نے سر تکیے پر رکھ دیا اور چھت کو گھورنے لگے یہ ان کی پرانی عادت تھی جب کچھ سوچنے لگتے یا جواب نہ
دینا چاہتے تو چھت کو دیکھنے لگتے۔

''آپ ایسا اس لیے سوچتے تھے شاید کہ ہمارے ذہنوں میں انسان اور بزرگ کی الگ الگ شکلیں ہوتی ہیں ''

مفتی جی نے چھت سے نظریں ہٹائے بغیر کہا، ''دیٹس دا پوائینٹ، پر مجھے بھائی جان کی صورت میں ایک انوکھا بابا
'' ملا، غیر روایتی قسم کا، جس نے مجھے خاصی حد تک ٹرانسفارم کر دیا

مفتی جی انکشافات کے موڈ میں تھے، ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ ان کے گرد اکثر ایک ہجوم ہوتا، وہ کوشش کرتے
کہ ان کی کچھ پرتیں نمایاں نہ ہو جائیں۔ یا پھر باتوں کا رخ اور موضوعات کچھ اور ہوتے۔

شاندار حسین انسان تھا، سٹایلش، شایستہ جیسے کویی سیانا بزنس مین ہو، بابوں والی کویی بات ہی نہ تھی اس میں۔ ''
''تھوڑی بات کرتا مگر ایسی کہ جتنے مرضی مطلب نکال لو اس کے

میں نے مسکرا کر کہا" وہ کویی بابا جی تھے یا ہیرو''؟

مفتی جی نے مجھے دیکھا بغور،

وہ ہیرو ہی تھے مگر وکھری قسم کے، مری کے رہنے والے اچھے خاصے امیر کبیر بندے تھے۔ بس چسکا تھا لوگوں ''
کی خدمت کرتے پھرتے۔ دنیا ان پر مرتی تھی وہ سایین جی پر مرتے تھے یہ تو بعد میں سمجھ آیی کہ بہت سارے
''بابوں تک پہنچ تھی ان کی

سایین جی کے مزار پر دوسری بار جانے کی دیر تھی کہ میرا فیوز اڑ گیا، دھاڑیں مار مار رونے لگا۔ ملک عزیز میری"
حالت دیکھ کر نہ پریشان ہویے نہ ہی حیران۔ وہ سکون سے دیکھتے رہے میرا تماشا یہ بابوں کے پی اے بھی عجیب
''لوگ ہوتے ہیں تماشا لگا کر انجان بن جاتے ہیں

مفتی جی کی آنکھوں میں دیپ جل رہے تھے۔ شایید وہ کھل کر باتیں کرنا چاہ رہے تھے اس دن۔

انسان کبھی کبھار اپنے کویاسے اپنے خول سے نکل کر شایید خود سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے شایید
میری طرح کا کویی بے ضرر، بے علم سا بندہ چاہیے ہوتا ہے جو آنکھیں پھاڑے سب سنتا جایے۔

ایک بار انہوں نے مفتی جی کو بتایا کہ مجھے آپ کی آمد کی پہلے سے خبر مل چکی تھی بھائی جان کے ذریعے کہ ایک ایسا لکھاری آرہاھے اس شہر میں جسے اللہ والوں کی دہلیز تک جانا ہے۔

میں سوچتی رہی یہ بابے کیسے کیسے کام کرتے ہیں؟ ان کو کتنا اختیار ہوتا ھے کتنی طاقت ہوتی ہے ان کے پاس؟ جب چاہیں جہاں چاہیں بندے کو پھینٹ کر رکھ دیں، اس کارخ بدل دیں۔

شہاب صاحب بھی کہا کرتے تھے اکثر، ''ہماری اس مادی دنیا کے مساوی ایک اور دنیا بھی ہے۔ روحانی دنیا جہاں ''اسی طرح افسران اور ماتحت ہوتے ہیں جیسے اس دنیا میں

شاید اسی لیے کچھ بابے صرف سپاہی ہوتے ہیں کچھ ڈی ایس پی اور کچھ آیی جی جیسے۔ ان کے اختیارات کی حد بھی اسی حساب سے ہوتی ہو گی۔

ہر ایک کے الگ الگ فرایض اور حقوق ہوتے ہوں گے۔ فرق محض اتنا ہے کہ وہاں دم مارنے کی مجال نہیں۔ کویی نہیں جانتا کب اور کس خطا پر اس کی دستار چھن جایے، وہاں کویی چارج شیٹ نہیں ہوتی بس سزا سنایی جاتی ہے، ! عہدہ چھین لیا جاتا ہے یا ڈیموٹ کر دیا جاتا ہے۔ کتنا عجیب اور انوکھا لگتا ہے یہ سب

بابوں اور بابوں والوں کے رنگ ڈھنگ ہی الگ ہوتے ہیں، یہ مجھے مفتی جی اور شہاب صاحب کی معیت میں رہ کر پتہ چلا۔ بابا بننا آگ پر ننگے پایوں چلنے کے مترادف ہوتا ھے۔ زرا چوکے نہیں تو راکھ کا ڈھیر حوصلہ رکھا تو صحیح سالم !

عجب نگری ہے یہ بابوں کی نگری بھی، جس کی ذرا سی جھلک نے مجھے اس مادی دنیا میں مس فٹ کر دیا۔ جانے وہ کیسے جیتے ہیں اور یہ سب برداشت کرتے ہیں جو اس نگری کے باسی بن چکے ہوتے ہیں۔

اصلی بابے کہتے ہیں کہ ہم تو حکم کے غلام ہیں چوں نہیں کر سکتے اپنے سینیرز کے آگے اور سینیارٹی میں جانے کون کہاں موجود ہوتا ہے؟ یہ بھید اللہ اور اس کے خاص بندے ہی جانتے ہیں

! ایک عام دنیادار کے تو پرخچے اڑ جاتے ہیں یہ سب سوچ کر ہی

ایک بات اور، یہ بھی اوپر والے کی مرضی ہے کہ وہ کس کو کس کام کے لیے چن لے۔ مفتی جی کا مسلہ بہت ٹیڑھا تھا وہ اللہ میاں سے بھاگ رہے تھے اور اللہ میاں انہیں درجہ بہ درجہ اپنے خاص ہرکاروں کے ذریعے دھیرے دھیرے گھیر رہے تھے، مفتی جی کی حواس باختگی کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

ڈیوٹی

شہاب صاحب سے جب کبھی بابوں کا ذکر ہوتا تو خاموش ہو جاتے۔ پاکستان میں پچھلی ہڑ بونگ کا ذکر ہوتا، بے سمتی کیبات ہوتی تو خاموش ہو جاتے۔ لیکن ان کے چہرے پر ہلکی سی بے بسی کی جھلک نمایاں ہو جاتی۔ ایک دو بار بس اتنا ہی کہاء

پاکستان کی فکر چھوڑ دیں اللہ کا بوجھ اٹھانے کی کوشش نہ کریں، بس یہ خیال رکھیں کہ آپ کا کویی بھی کام کویی "ایک لفظ بھی پاکستان کے خلاف نہ ہو۔ اللہ سے ڈرنے کی بجایے اسے ساتھی بنا کر انگلی سے لگالیں، کافی ہے۔"

ہماری اتنی اوقت کہاں؟ ہم تو دنیا میں لتھڑے لوگ ہیں اللہ کو مستقل کیسے انگلی سے لگا کر گھومتے رہیں؟ ہمارے تو سارے کام رک جاییں گے، ناکام کہلاییں گے دنیا میں دنیاداری کے بنا کیسے چلے گا؟ لوگ ہنسیں گے ہم تو آیوٹ آف فیشن سمجھے جاییں گے۔

میں اپنی اس فضول سی سوچ کو زبان نہ دے سکی لیکن مجھے یقین ہے میری سوچ کو انہوں نے پڑھ کر اپنے اندر جزب کر لیا ہو گا یہ انہی کا حوصلہ تھا

میں نے جب شہاب صاحب کی وفات کے بعد یہ بات مفتی جی کو بتایی تو وہ بے چین سے ہو گیے کچھ نہ بولے منہ سے، بس جلدی جلدی ایک گلاس پانی اپنے اندر انڈیل لیا۔

! بابے واقعی کھ نہیں چھوڑتے بندے کا

بابوُں کا ذکر اس لیے کر رہی ہوں کہ جب میں ان دونوں کو ملی تھی تو وہ بابوں کے عہدوں پر ہی فایز تھے مگر ! انکاری تھے۔ کون سینیر تھا کون جونیر یہ راز بھی نہ کھلا، شاید ان کی ڈیوٹی انٹیلیجنس کی تھی بابوں کی دنیا میں

خود کو چھپایے رکھنے کا حکم تھا انہیں؟

لبیک '، 'شہاب نامہ' اور 'ایلی اور الکھ نگری' نے کسی حد تک کچھ اشارے دیے مگر راز راز ہی رہا۔ '

خوابوں کا سلسلہ جو شہاب صاحب نے شروع کیا، اشارے جو مفتی جی دیتے رہے شہاب صاحب کے بارے میں، ان کا کویی تو مقصد تھا ورنہ میں کون اور میری اوقات کیا!؟

! شاید کبھی جان سکوں

مفتی جی اور شہاب صاحب کا ذکر ایک ساتھ ہونا لازم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا پرتو تھے یا کویی درجہ بندی تھی یہ خبر نہیں لیکن کویی ان دیکھی بہت مظبوط ڈور تھی ان دونوں کے درمیان۔

ایک دن میں نے مفتی جی سے پوچھا تھا کہ کیا آپ بھی بزرگ ہیں؟ کیا مقام ہے آپ کا تو کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے، ''توبہ توبہ تمہیں پتہ ہے بزرگ ہونا کتنا بڑا مجاہدہ ہے؟ بزرگ وہ نہیں جو شعبدہ بازی کرے پیش گوییاں کرے۔ اصل بزرگ تو خود آگ پر ننگے پایوں چلتا ہے کسی کی بجایی ہویی ڈگڈگی پر ناچتا ہے اپنا تن من وار کر، اپنے ''کل سے بے خبر

وہ کیسے ''؟ تجسس کی ماری میں نہ چاہتے ہویے بھی بار بار سوال کر دیتی ''

شہاب کہتا تھا بزرگ تو بہت عاجز، بہت بے بس اور پابند ہوتا ہے احکامات کا۔ اس کے پاس تو غلطی کی گنجایش بھی '' ''نہیں ہوتی، عام انسان تو بہت خوش قسمت ہوتا ہے بہت حد تک آزاد غلطیوں کی معافی بھی مل جاتی ہے

ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ جو کرامات دکھایے، پیش گوییاں کرے جس کے پاس طاقت ہو مستقبل بدلنے کی وہ '' بزرگ ہوتا ہے ''میں نے کہا

طاقت دی جاتی ہے مگر اس کے استعمال پر اتنی نگرانی، اتنی پابندی اتنا بوجھ کہ تصور بھی مشکل ہے اصلی بزرگ "
کبھی شعبدے بازی نہیں کرتا" مفتی جی کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی تو کھانسی کا دورہ پڑ گیا، کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے،

جانتی ہو شہاب کہتا تھا عام آدمی جتنی اچھائی کرے گا اتنا صلہ ملے گا مگر بزرگ سے سوال ہوتا ہے کہ اختیار "
" پچاس نیکیوں کا دیا تھا پچیس کیوں کیں؟ بہت مجبور ہوتا ہے بزرگ اپنی مرضی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا

کتنی عجیب بات ہے اور ہمارا علم کتنا محدود، ہم تو اسی کو بزرگ سمجھتے ہیں جو جیسے چاہے کرے، جسے چاہے پٹخنی دے دے جسے چاہے آسمان پر بٹھا دے۔ میرے لیے تو نت نئی باتیں تھیں یہ ساری۔ مفتی جی نے میرے خیالات جیسے پڑھ لیے،

جھلیے روحانی دنیا میں اپنی ذات کو شکنجے میں جکڑنا پڑتا ہے۔ میں نے شہاب کو تڑپتے دیکھا ہے۔ بہت سخت "
مقامات آتے ہیں اس راہ میں وہ تو کھلتا بھی نہ تھا ہزار سر ٹکرا یو وہ اپنا پتہ نہ دیتا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد تھوڑی جھلک
" دیکھائی اس نے

مفتی جی کے چہرے کے تاثرات اس سمے ایسے تھے کہ بیان کرنا مشکل ہے، ان کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا کہ میں چند لمحوں کے لیے مبہوت ہو گئی تھی۔ وہ کوئی اور ہی مفتی جی تھے۔ اچانک وہ سنبھل گیے خود کو پھر ملفوف کر لیا، جھٹ سے چق تان لی۔

مفتی جی کبھی فارم میں ہوتے تو میں کوشش کرتی کہ اپنے تجسس کی تشفی کر سکوں، شہاب صاحب کے جانے کے بعد یہ کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ ورنہ تو واقعی کو کڑوے تھے۔ خود کو کبھی ظاہر نہ کیا۔ سو موقع ملا تو پوچھا۔

"یہ مجاہدہ کیا ہوتا ہے؟ "

میں نے بھی شہاب سے کیی بار مجاہدہ کے متعلق پوچھا تھا، پر اکثر وہ بات گول کر جاتا۔ ایک دن سنجیدگی سے کہنے " لگا کہ مجاہدہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں بہت حوصلہ چاہیے، ہڈیاں چٹخا دیتا ہے سمجھو جیسے دھوبی پٹڑا، اتنا سخت کہ پٹخ پٹخ کر ساری سیاہی دھو ڈالتا ہے اندر باہر کی"

اس کا فایدہ؟" میں نے بے وقوفانہ سوال کیا "

کہنے لگے "شایید معافی ملتی ہو کسی لاپرواہی کی یا اندر کی دنیا بدل جاتی ہو اس سے، ورنہ باہر تو وہی ہوتا ھے جو اللہ کی مرضی۔ اس کے فیصلے نہیں بدلتے۔ بس سمجھو اندر تکلیف کی شدت ختم ہو جاتی ہے، سر جھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے اس کے فیصلوں کے آگے۔ جب قبولیت پیدا ہو جایے، ریزسٹنس ختم ہو جایے تو سکون آ جاتا ہے۔ شہابہ یاد رکھنا سارا فساد ہی ریزسٹنس کا ہے"

پھر خود ہی کہنے لگے کچھ سوچ کر "میں شہاب کو بزرگ ماننے کو تیار تھا بلکہ مان چکا تھا اس کا کردار اس کی پراسراریت اور افکار سب کچھ بہت الگ تھا۔ میں اس سے بہت متاثر تھا پر وہ میری عقیدت سے گھبراتا تھا کہتا تھا عقیدہ پالو عقیدت نہیں"

یہ تو انہوں نے مجھے بھی ایک بار سمجھایا تھا۔ بہت ساری باتیں وہ ادھوری سی کرتے تھے جیسے اشارے ہوں۔ " میری عقل اور سمجھ محدود میں بہت کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی" میں نے کہا

ہاں وہ ایسا ہی تھا بھید چھپانے والا اور میں بڑبولا، پتہ نہیں وہ میری شدت کو کیسے جذب کرتا تھا؟ شہابہ سچ بتایوں " مجھے لگتا ھے میں اس کے راستے کی رکاوٹ تھا جیسے ہر بزرگ کے ساتھ اس کی ایک آزمایش جڑی ہوتی ہے نا میں اس کی بہت بڑی آزمایش تھا "

لگا مفتی جی بھی خود کو کیموفلاج کرنے کا گر سیکھ چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتی مفتی جی کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ ان کے گردوں میں شدید درد اٹھا۔ امی جی نے انہیں دوا دی میں تھوڑی دیر میں اٹھ کر آ تو گئی لیکن ان کی باتیں میرے من میں مزید کئی سوالات کو جنم دینے لگیں۔

بظاہر مفتی جی اور شہاب صاحب ایک دوسرے کی ضد تھے شروع میں، ایک متوازن دوسرا شدت کا بھرا، ایک بھید چھپانے والا دوسرا کہہ دینے والا، ایک بھڑکن ہی بھڑکن، دوسرا دھیمی دھیمی آنچ۔ لیکن اندر ہی اندر کہیں فیوز جڑا ہوا تھا، ایسا کوئی 'انڈر گرایونڈ کنکشن' تھا جسے دیکھنے کے لیے 'خاص آلات' کی ضرورت تھی شایید جو ہر کسی کے پاس نہیں ہوتے۔

مفتی جی کو وہی جانتے ہیں جو ان کے قریب رہے۔ وہ ایک کھلی کتاب تھے لیکن سمجھنے والوں کے لیے۔ ان کے دایرے میں ہر کوئی نہیں آسکتا تھا بھلے سارا دن سارا سارا سال بیٹھا رہتا۔ ان کی فریکوینسی کو پکڑنا ہر ریسیور کے بس میں نہ تھا۔ اگرچہ لگتا ہر کسی کو یہی تھا کہ مفتی جی اس کو بہت توجہ دیتے ہیں۔ لیکن کہانی کچھ اور تھی۔ وہ بھلا سب کا کرتے تھے لیکن اپنے ریڈار کی حد میں کسی کسی کو داخل ہونے دیتے۔ بدنصیب تھے جو ان کے ارد گرد منڈلانے کے باوجود بھی ان کے دل کے قریب نہ ہو سکے۔ سمندر کے پاس آن کر بھی کنارے پر ہی کھڑے رہے، اور وہیں سے گہرائی کو ماپنے کے دعوے کرتے رہے۔

یہ سب کچھ نہ تو زیب داستاں کے لیے لکھ رہی ہوں نہ ہی کسی کا امیج بنانے کو، میں تو دیکھا ان دیکھا، سنا ان سنا، جو محسوس کیا پوری ایمان داری کے ساتھ آپ کے ساتھ شیئر کر رہی ہوں۔

!شایید میری اتنی سی ہی ڈیوٹی تھی

سپونج اور خواب

شہاب صاحب روحانی سفر میں مفتی جی کے راہنما اور ایسے سپونج ثابت ہویے جو ان کی شدت کو بغیر جتلا یے، محسوس کروایے، چیلنج کیے، اپنے اندر جذب کرتے رہے۔ مفتی جی خود کو 'کوکڑو' کہتے رہے لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے مگر وہ انجانے میں ''گل'' چکے تھے بہت عرصہ پہلے !

کیونکہ مفتی جی بار بار ٹکرانے والے بابوں کی وجہ سے یہ سوچنے پر مجبور ہو چکے تھے کہ سائنس اور قرآن کا کویی نہ کویی رشتہ ہے۔ انہوں نے جب قرآن کا مطالعہ کیا تو انکشافات نے عقل ماوف کر دی۔ یہی تو وہ 'کل' ہے جس کے 'جزو' مغربی دانش ور اور سائنس داں دہراتے رہتے ہیں۔

قران کے مطالعے نے ان پر ایک نیا جہان آشکار کیا۔ قرآن اور شہاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، مفتی جی کے اندر محض عقل اور دلیل کے خمیر سے سجایے محنت سے سنوارے بت ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ اب وہ دانش اور جذبات کا ایک ایسا امتزاج دیکھ رہے تھے کہ محض مادیت سے بنے پھریرے چیتھڑے چیتھڑے ہوتے گیے اور اللہ میاں مضبوطی سے قدم جماتے گیے !

شہاب صاحب نے مفتی جی کی ذات کے تمام 'کوکڑوں' کو غیر محسوس طریقے سے چھینٹا کوٹا اور تڑکہ لگا دیا۔ مفتی جی کو خبر بھی نہ ہویی جب سمجھ میں آیا تو ہانڈی پک چکی تھی۔

مفتی جی اب تلملا بھی نہ سکتے تھے سو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ شہاب صاحب کے وصال کے بعد ان میں مزید تبدیلیاں آنے لگیں۔

اکثر خاموش رہتے، جانے کیا سوچتے رہتے۔ ان کی جسمانی تکالیف بھی بڑھ چکی تھیں صبر کے ساتھ ساتھ۔

مفتی جی کو طبعا رونا نہیں آتا تھا شاید۔ بس چپ ہو جاتے تھے۔ دکھ اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھاتا رہتا۔ ان کی حالت سے سبھی واقف تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے سوا یے انہیں خاموش تسلی دینے کے۔

کہنے والے بہت کچھ کہتے ہیں۔ اپنی اپنی سوچ کے مطابق لیکن جو میں نے برتا، آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا اسے کیسے جھٹلا دوں؟

یہاں صرف دو واقعات کا ذکر کروں گی۔

۱۹۸۵ کی سردیوں میں ایک دن شہاب صاحب کی لائبریری میں بیٹھے بیٹھے ان سے کچھ پوچھا ایک ذاتی مسلہ تھا، سن کر خاموش ھو گیے کافی دیر بات نہ کی لکھنے میں مگن رہے، میں بیٹھی رہی مگر مسلسل خاموشی نے مجھے پریشان کر دیا۔

میں نے پوچھا، ''میں جایوں''؟

تو ھاتھ کے اشارے سے جانے کا اشارہ کیا، میں تھوڑی شاکی ہوئی کہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بڑی محبت اور احترام کے ساتھ رخصت کرتے تھے ہمیشہ۔ میں گھر آ گیی۔

مگر عجیب سی الجھن نے مجھے گھیرے رکھا۔

رات خواب میں مجھے میری بات کا جواب بذات خود انہوں نے دیا۔ صبح اٹھی تو گنگ سی تھی۔ فون ملایا مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے جب سلام دعا کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

رات جواب مل گیا تھا آپ کو اپنے سوال کا''؟

میں نے بمشکل اتنا پوچھا، ''لیکن اس طرح کیوں''؟

''کہنے لگے، ''ہر بات کا جواب براہ راست دینے کی اجازت نہیں ہوتی

اس کے بعد تو کچھ ایسے سلسلے نکلتے گیے کہ میں ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح تحیر کی ایک الگ ہی دنیا میں پہنچ گیی۔

مفتی جی سے ذکر کیا اس واقعے کا تو ان کے لبوں پر بھی جیسے زپ لگ گیی، بہت سر مارا مگر بے سود۔

!کویی تبصرہ نہ کویی جواب

شہاب صاحب کے وصال کے بَعد ایک رات محمودہ آنٹی اور فوزیہ کے حوالے سے مجھے خواب میں انہوں نے کچھ بتایا اور ہدایات دیں اس حوالے سے۔ میں نے فوزیہ کو فون کر کے پہلے تو تصدیق کی اس خبر کی۔

''وہ حیران مجھ سے پوچھنے لگیں،

آپ کو کس نے بتایا اس بارے میں مجھے بھی ابھی ابھی رپورٹ ملی ھے''؟

یہ سن کر چند لمحوں کے لیے مٰیں واقعی سن ہو گیی۔

خود کو سنبھالا اور اپنے خواب کا ذکر کیا ساتھ ہی شہاب صاحب کا پیغام بھی دے دیا۔

۔کچھ عرصے بعد مجھے فوزیہ کی ملتان کے نشتر ہسپتال سے کال موصول ہویی کہ تمہارا خواب میں بھول گیی تھی۔ اس کے مطابق عمل نہیں کیا اور نتیجہ وہی آیا جو تمہیں شہاب صاحب نے خواب کے زریعے بتایا تھا۔ ہم دونوں اس خواب کے حوالے سے کافی دیر شہاؔب صاحب کا ذکر کرتی رہیں۔ محمودہ آنٹی بھی حیران تھیں کہ ان کے بھایی نے ان سے کیوں رابطہ نہیں کیا؟ یہ بات آج تک میرے لیے بھی معمہ ہے۔

خوابوں کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک چلا پھر اچانک منقطع ہو گیا شاید میرا پیمانہ بہت چھوٹا تھا چھلک گیا۔

شہاب صاحب اور مفتی جی دونوں سبھی کو یہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو کبھی نہ گالی دینا نہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا نسلیں برباد ہو جاییں گی۔

پاکستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ھے کہ اسے لوٹنے اس سے غداری کرنے اور اسے گالی دینے والوں کی اولادیں بھی عزت وتوقیر سے محروم ہو گییں بلکہ مٹ گییں۔

کچھ واقعات چونکہ ان ہستیوں پر لکھے ہوے میرے مضامین میں شامل ہیں سو ان کا یہاں ذکر دہرانا نہیں چاہتی (یہ مضامین اسی کتاب کے آخر میں موجود ہیں)

پھیر کچھ ایسا ہوا کہ سبھی رابطے ہر جانب سے ٹوٹ گیے۔

مفتی جی کے جانے کے بعد تو زندگی الگ سے دھارے پر بہ نکلی۔ ان دونوں کی نام لیوا ہونے پر بھی طعنے سنے۔ روحانیت کو ڈرامہ قرار دینے والوں کی طنزیہ مسکراہٹیں بھی برداشت کیں۔

آخر خود ہی ان محفلوں سے دور ہوتی گیی جہاں علم وادب کے نام پر ہوس و بے ادبی کا بازار گرم تھا۔

کچھ حقیقی لکھاری کونوں کھدروں میں بیٹھے ان ہنگاموں سے دور تخلیقی کام میں مصروف رہے۔ ابھی بھی وہ اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور میں انہی سے کبھی کبھار رابطہ کر لیتی ہوں۔

آج بے جان سڑکوں پر بیخ بستہ ناموں کی تختیاں لگی دیکھتی ہوں۔ مگر پاکستان کے محسنوں ان دو عظیم لکھاریوں کا نام کسی شاہراہ پر نہیں ایستادہ دیکھا۔ کیونکہ وہ استحصالی آقاییوں اور پاکستان کو بیچنے والوں کے گن نہ گا سکے۔

یہاں ادب اور ثقافت کے نام پر باہر والے آقاییوں کے گماشتے جو کچھ کر رہے ہیں اس کے نتایج مجھے بہت بھیانک نظر آتے ہیں۔ مگر ارباب اختیار اور ہمارے نام نہاد دانشور اپنی اپنی بانسریاں بجانے میں مصروف ہیں۔

ناامیدی کی حالت میں ایک نرم اور ایک دبنگ سی آواز میرے کان میں سرگوشی کرتی ھے،

"جس نے پاکستان بنایا ہے وہی اس کی حفاظت کرے گا"

اور میری آس کی ڈوبتی سانسیں بحال ہونے لگتی۔

ٹھنڈا میٹھا چشمہ

ولی تھا مجذوب تھا یا محض اعلیٰ صفات کا حامل ایک بہترین انسان؟۔جو بھی تھا ہجوم میں رہتے ہوئے ہجوم سے الگ۔

ایک منفرد تنہا انسان جس کی ذات ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ تھی جیسے سمندر پیاسے کا نام اور ذات نہیں پوچھتا اس نے بھی اپنے در پر آنے والوں کا حسب نسب عمل، عمر، گروپ کچھ بھی نہ پوچھا۔

''پوچھا تو محض اتنا، ''تیرا مسلہ کی اے۔۔

جھولیاں بھر بھر بھیجا، دعایوں کی مشوروں کی نایاب باتوں اور ہومیو پیتھک پڑیوں کی۔

اس کی اپنی زندگی اور ذات میں جوار بھاٹے تھے تلاطم تھے ہزاروں بھنور تھے مگر وہ سب کچھ گہرائیوں میں چھپائے، دوسروں کے غم اپنے اندر انڈیلتا رہا۔

۔اپنے شفاف پانیوں میں آنے والوں کی کثافتیں جذب کر کے نتھرے ہوئے ہلکے پھلکے بندے ری کنڈیشن کرتا رہا۔

شاید اس کا کردار ایک چھلنی کا تھا تمام عمر ایک بشپ کی مانند اپنوں پرایوں کے اعترافات اپنے چہرے پر سجاتا رہا۔

سبھی شانتی حاصل کرتے رہے اپنا بار اس کے کاندھوں پر منتقل کرتے رہے۔

اس کا چہرہ دراڑوں سے اٹا رہا، کسی دوست کسی سہیلی کا کوئی نہ کوئی المیہ ایک نئی لکیر بن کر اس کے چہرے پر ثبت ہوتا رہا

۔وہ استقامت کا پیکر ادھر ادھر کے زخموں کی ہتھوڑیاں سہتا رہا۔ حیرت ہے کہ ہر ضرب اس کے نقوش سنوارتی گیی۔ اس کے زاویے مزید تیکھے ہوتے گیے، نکھرتے گیے۔

وہ منحنی ساوجود ایک بہت بڑے مجسمے کی صورت میں ڈھلتا چلا گیا۔۔شایید اس لیے بھی کہ اس دنیا میں انسانوں سے زیادہ مورتیوں کی پوجا کی جاتی ہے۔

وہ نہ نہ کرتا ہاتھ جوڑ جوڑ کر عزت و تکریم سے بھاگتا رہا مگر اس کا قد بڑھتا چلا گیا حتیٰ کہ وہ چھا گیا۔

میں نہیں مانتی وہ چلا گیا ہے وہ یہیں ہے ہمارے درمیاں۔

آخری دیدار کے وقت چہرے پر نظر پڑی تو یوں لگا جیسے کویی دھوپ کا جلا اچانک ہی کسی گھنے سایے کی پناہ میں آجایے۔ مٗیں منتظر رہی کہ وہ ابھی اپنی مسکراتی نگاہوں کا لشکارا مارتا اٹھ بیٹھے گا اور کہے گا،

"لے تسی تے سچی مچی رون لگ پییاں جے کڑیو میں تے مذاق کر رہیا سی "

بانو آپا اپنے رسان بھرے لہجے میں ہم بے حوصلہ لوگوں کو سمجھا رہی تھیں یہ جو چلے گیے محبت اور انسانیت کے فوارے تھے ہم سب تو خوش قسمت ہیں جو ان کے پاس بیٹھتے رہے۔

۔اس تکون کے راز تو وہی جانیں لیکن 'لبیک' میں 'کالے کوٹھے' والے کی جس ادا پر مفتی جی قربان تھے وہ تھی ! کالے کوٹھے والے کی بھرے ہجوم میں ہر شخص سے انفرادی محبت انفرادی توجہ

۔انجانے میں مفتی جی نے خود بھی وہی چلن اپنا لیا، ہم سب کو اپنا بنا لیا۔

ہم بالشتیے اس کے پاس جا کر یکدم باون گزے ہو جاتے۔ مجروح انا کو وقار بخشنا اور منبر پر بیٹھے فرعون کو معصومیت کے ساتھ پٹخنی دینا بھی اسی کا کمال تھا۔

مجھے بھی فخر حاصل ہے کہ مجھے ایک دوست، بہن، بھائی، ماں باپ سبھی رشتوں کا پیار ملا اس سے۔ کتنی ہی مٰعصوم !خوشیاں اور کتنے بڑے بڑے دکھ اس نے جانے کس کس کے بانٹے کاش وہ جانتا وہ کتنا تنہا کر گیا ھے

بچوں کی طرح لڑتے بحث کرتے کبھی تو امی جی ہنس کر کہتیں۔

شہابہ ایناں دی تے عادت ای کھپن تے کھپان دی تو نہ کھپیا کر"۔"

کیسے بتاؤں اس بے لوث انسان کے ساتھ کھپنا بھی ایک ٔعبادت تھی اب وہ عبادت کیسے کروں؟

جانے اس کی زنبیل میں محبت کے دروازوں کی کتنی چابیاں پڑی رہتی تھیں کہ ہر دل کے دروازے کا قفل اسے کھولنا آتا تھا۔

چمکیلی سردیوں کی ایک دوپہر ہم ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے حسب معمول کھپ رہے تھے پاکستان کا ذکر شروّع ہوا۔ میں نے ہر طرف پھیلی کرپشن کی بات کی تو کہنے لگا،

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو جس نے پاکستان بنایا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔۔ "

میں نے پوچھا،

" کیسے اتنا یقین ھے آپ کو؟ "

تو اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپکا تھا جس کی روشنی آج بھی میرے ارد گرد پھیلی ہوئی ھے۔ اس نے شہاب صاحب کے وہی الفاظ دہرائے جن پر میرا ابھی ایمان ھے۔

"شہاب کہنداسی "پاکستان از کریٹڈ تو بی دا سیٹ آف امام مہدی۔۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک بار شہاب صاحب کی سٹڈی میں بیٹھی تھی۔ وہ شہاب نامہ کا ایک باب لکھ رہے تھے)
روحانیت اور پاکستان کا ذکر تھا۔ میں نے کہا اتنی کرپشن اتنا بگاڑ ہے کیا بنے گا پاکستان کا؟

" شہاب صاحب گھمبیر لہجے میں کہنے لگے، "جس نے بنایا ہے پاکستان وہ خود اس کی حفاظت کرے گا

"میں نے پوچھا، "آپ کو اتنا یقین کیسے ہے؟

"جواب ملا، "کیونکہ یہ ملک امام مہدی کی سیٹ بننے کو وجود میں آیا ہے

مفتی جی اور شہاب صاحب مزید اس موضوع پر کبھی نہ کھلے۔

ہمارا یہ مکالمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ مفتی جی بھی انگریزی ہی میں وہ مخصوص جملہ دہراتے تھے مگر پھر چپ لگ جاتی تھی۔

اس کے لہجے میں اتنی مظبوطی تھی کہ میں کچھ نہ کہہ سکی۔

اسے معجزوں پر یقین تھا مجھے بھی ہے۔ مگر کیا معجزے اب بھی رونما ہوتے ہیں؟ اگر ہوتے ہیں تو خدا سے دعا ہے کہ ان جیسے کچھ اور لوگ زمیں پر بھیج دے۔

کثافت سے دم گھٹنے لگے ہیں کہ لوگوں کی دور کی نظر کام نہیں کرتی۔ ہر کوئی اپنے قدموں سے آگے دیکھنے سے قاصر ہے۔

اسی سالہ بچہ۔۔ ممتاز مفتی

نام تو کیی بار سنا تھا اس کا مگر اشفاق احمد کی 'سفر در سفر' پڑھ کر یوں لگا کہ وہ خود بھی کویی انوکھا دلچسپ سا کر دار ہے اپنی کہانیوں کا۔

اتفاقا 'لبیک' میرے ھاتھ لگ گیی۔ روایتی قسم کا سفر نامہ سمجھ کر پڑھنی شروع کی، جوں جوں پڑھتی گیی، پیاس بڑھتی گیی۔ یا اللہ اتنا اثر، اتنا جذبوں میں بھیگا، اتنا سچا یہ شخص کس دنیا کا باسی ھے؟

جھوٹ اور منافقت کے اس دور میں اپنے گناہوں کی گٹھڑی سر پر لادے گلی گلی مارا مارا پھر تا ھے۔ ایک ایک گناہ نکال کر اس کی نمایش کر تا ھے، پکار پکار کر کہتا ھے،

"لو دیکھو مجھے میں ہوں ایک گنہ گار جو اس دنیا کے لیے باعث عبرت ہے"

اپنی کو تاہیوں کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتانا اپنی غلطییوں کے اعتراف کا اتنا حوصلہ؟ اتنے ظالمانہ سچ اور وہ بھی اپنی ذات کے بارے مٰیں؟

!!میں تو حیران رہ گیی

اور جب میں نے 'لبیک' کو بارھویں بار ختم کیا تو میرا چہرہ پہلی بار ہی کی طرح آنسووں سے بھیگا ہوا تھا۔

خدا شناسی کا ایک انوکھا انداز سکھایا اس نے۔ مجھے یوں لگا وہ سب گناہوں سے دور، دھلا دھلایا اجلا سا ایک جانب کھڑا ھے مجھے رشک آیا، پتہ نہیں کبھی میں بھی اپنے خدا سے یوں مخاطب ہو سکوں گی یا نہیں؟

شدت سے خواہش جاگی کہ کم از کم میں ایک بار اسے دیکھ لوں،

کیی سال گزر گیے۔

اس دوران اس کی تصویریں دیکھیں، انٹرویو پڑھے، افسانے پڑھے۔ اس کی ذات مجھے مانوس سی لگنے لگی۔

لکھنے کا شوق مجھے بھی تھا لکھتی بھی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ میرا ایک ساتھی اس کا رشتے میں نواسہ لگتا ھے۔

اس نے پوچھا، ”تم اپنی تحریریں میرے نانا کو کیوں نہیں دکھاتیں“؟

دل کی دھڑکنیں تیز ہو گییں، ”تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتایی کہ وہ تمہارے نانا ہیں؟“ میں اس پر بگڑنے لگی۔

”وہ ہنس کر کہنے لگا، ”اس لیے کہ نانا دوستی میں بہت ماہر ہیں تم ساری دنیا بھول کر ان سے دوستی کر لو گی

!ہوا تو خیر وہی

میری تحریریں پڑھنے کے بعد جب مفتی جی نے مجھے پیغام بھجوایا کہ اس لڑکی سے کہو مجھے ملے آ کر تو مجھے جذبوں کی صداقت کا قاییل ہونا پڑا۔

پھر سردیوں کی ایک شام میں اس کے ڈراییںگ روم میں بیٹھی اس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ منحنی سا وجود، سفید بالوں کا گچھا سا سر پر سجایے۔ دونوں ٹانگیں سکوڑے، صوفے پر بیٹھا وہ شخص کسی کلف کسی اکڑ سے آزاد تھا۔

!سیدھا، سچا کھرا سا

تمہاری تحریروں میں جان ہے چمک ہے لکھو، مگر یاد رکھو لکھو گی تو دکھی رہو گی سکھی رہنا چاہتی ہو تو لکھنا بند کر ”
“دو اس سے حساسیت بڑھتی ھے اور ساتھ ہی کرب بھی

''میرا جواب تھا، ''مجھے منظور ہے مگر لکھوں گی ضرور

یہ سن کر اس کی آنکھوں میں ایک لہر سی ابھری، مسکراہٹ کی آڑ لے کر وہ بولا۔

" تے فیر لخذی رہ تے دکھی رہ "

شروّع کی ایک دو ملاقاتوں میں ذرا جھجک سی تھی کہ وہ زندگی کے تجربات و حوادث کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنے والا اسی سالہ نامور ادیب اور میں ایک نو عمر طالبہ۔

''مفتی جی کے بقول، ''میں نے بھرپور زندگی گزار لی ہے اب کویي ارمان نہیں باقی

جبکہ میں 'ابھی کچھ نہیں' کا بورڈ لٹکاے، عملی زندگی کی دہلیز کو ابھی چھونے والی ایک نوجوان لڑکی۔

لیکں جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ تو انتہایي بے ضرر پیارا سا انسان ھے۔ جس کے اندر ابھی تک ایک بچہ چھپا ہوا ھے، جو کلکاریاں مارتا ھے، ہمکتا ھے کھکھلاتا ہے اور ننھی ننھی سی مٹھیاں بھینچ کر اپنے بازو بھی ہوا میں لہراتا ہے۔

! بغیر کسی بندش کے کسی منافقت کے

اور میری دوستی اسی بچے سے ہوگیی۔ جو کبھی کبھار بزرگ نما دوست کا روپ بھی دھار لیتا ہے۔

! جس کی کویي عمر ہے نہ عہدہ

وہ تو صرف ایک بچہ ہے معصومیت اور سچایي کا سمبل! جہاں جیسے جو دیکھتا ہے اس کا بلا خطر بلا جھجک اظہار کر دیتا ہے اور بس۔

''اس نے مجھے 'علی پور کا ایلی' یہ الفاظ لکھ کر دی، ''شہابہ انور خبردار اسے نہ پڑھنا یہ اخلاق بگاڑنے والی کتاب ھے

نہ جانے مجھے ایک لمحے کے لیے کیوں یہ محسوس ہوا کی اس فقرے میں ہلکا سا احتجاج ھے، ایک دکھ ہے اور میں نے وہ کتاب چند دنوں میں ختم کر ڈالی۔۔

مفتی جی آپ زندگی کی سچایوں کو اتنی خوبصورتی سے پیش کر سکتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر آپ کا امیج ایک ”
“ضدی، اکھڑ اور شدت پسند بچے کا سا بنتا ہے

میرے تبصرے پر وہ کھکھلا کر ہنس دیا،

“ تمہیں کس نے کہا کہ میں بدل گیا ہوں ؟ میں اب بھی ویسا ہی ہوں ”

واقعی غصے کا عالم اب بھی بچوں جیسا ھے، اونچا بولتا ہے زور زور سے بولتا ھے، پھر نہ کسی کی سنتا ہے نہ مانتا ھے۔ بیمار ہو گا تو لاکھ بہلایو، ڈانٹو، سمجھایو مجال ہے کہ احتیاط کر لے، جس چیز سے منع کرو وہی کھایے گا،

“تم لوگ جتنی نصیحت کرتے ہو مجھے اتنا ہی مزہ آتا ھے، ضد پیدا ہوتی ھے ”

وہ چٹخارے لے کر کہتا ھے۔

! گلا خراب ہو گا کھانسی کا دورہ پڑتا ہے پڑتا رہے اس کی بلا سے

کھووں کھووں کرتا رہے گا۔

پلنگ کے نیچے پڑے پیالے سے پان کے پتے نکال کر بڑے اہتمام کے ساتھ پان لگا لگا کھاتا جایے گا جیسے یہ اس کے لیے حیات دوام کی گولیاں ہوں۔

!! ضدی ہٹ دھرم انتہا کا

اس کی باتوں اور تحریروں میں کویی تضاد نہیں۔

وہ لکھتا ہے اس طرح کہ سیدھے پتھر کی نہیں مارتا، بلکہ غلیل کی ربڑ میں رکھ کر اس زور سے پھینکتا ھے کہ وہ مڑ کر خود اسی کو لگ جاتے ہیں

۔معاشرے کی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر نشتر زنی کر کے وہ بچوں کی طرح طرح تالیاں پیٹتا ھے۔ پیپ کو بہنے دیتا ہے درد کا مزہ لیتا ھے۔ پھر بڑے پیار سے مرہم لگاتا ھے۔اس انکشاف کے ساتھ کہ وہ تو خود اپنے ہی جسم کے بھوڑے کو کاٹ رہا تھا۔

اپنی ذات کو کسی نہ کسی حوالے سے آپریشن تھیٹر میں گھسیٹ لاتا ہے۔

کسی ماہر جراح کی طرح کاٹ چھانٹ کے بعد رسولیاں صاف کر دیتا ھے اور بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر ٹانکے لگاتا ھے۔

وہ اس فن میں ماہر ہے یکتا ھے پھر بھی کہتا ھے،

" میں بکواس لکھتا ھوں۔ روزی کمانے کا ڈھنگ ہے سارا "

مان لیجیے، وہ یہ الفاظ عاجزی کے ساتھ نہیں پورے یقین سے کہتا ھے۔

وہ انسانوں سے نہیں منفی رویوں سے نفرت کرتا ہے منافقت اور جھوٹ نہیں برداشت کر سکتا۔

دوستوں کے ساتھ جھگڑوں کا بہت شوق ہے اسے۔ کوئی مسلہ نہیں بھی ہو گا تو کھڑا کر لے گا، کرو اب اس سے جھگڑا !!

اپنا نقطہ نظر ٹھونسے گا نہیں لیکن اپنے اظہار خیال سے باز بھی نہیں آتا،

" تم نہ مانو اپنی من مانی کرو کون روکتا ھے ؟ مگر میں بھی تمہاری نہیں مانوں گا "

'' ایک دفعہ میں نے چڑ کر کہا، ''مفتی جی آپ سے دوستی ختم

بولا، ''کر کے دکھایو دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی'' مجھے ہنس کر یہ بات ماننا پڑی۔

احتیاط کا عنصر تو خیر زندگی میں شامل ہی نہیں۔

لباس کے معاملے میں لاپرواہی کی انتہا کر دیتا ھے۔ گھر والے چیخ چیخ کر کپڑے بدلوایں گے۔

وہ ایک کان سے سنتا ہے دوسرے سے اڑا دیتا ھے۔

کمرے کو کباڑ خانہ بنا رکھا ھے ادھر ادھر کتابیں بکھیرے، پلنگ کے نیچے پانوں والی سفلچی اور ساتھ ہی اگالدان رکھے وہ قالین پر یوں مطمین و مسرور بیٹھا ہوتا ھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت ھاتھ لگی ہو۔

''صفایی والے کو دیکھ کر ناک چڑھایے گا۔ ''ایک تو یہ میری جان کھا گیا ھے

آپ کا بس چلے تو سارے گلی محلے کا کوڑا اپنے کمرے میں جمع کر لیں'' ایک بار میں کہ بیٹھی ''

'' مزے سے ہنس کر کہا، ''تم نے میرے دل کی بات کہ دی

وہ کچھ غیر معمولی سا انسان ھے جیو اور جینے دو کا قاییل۔

وہ جیسا بھی ہے اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت ایک ایسا انسان ھے جس نے اپنی زندگی کے مصایب و مسایل کو مثبت انداز میں لیا ہے۔ اس نے اپنی ہر غلطی کا نقاد بن کر اس کا تجزیہ کیا اور دیانت داری کے ساتھ اس کا نتیجہ نکالا ۔

! اپنی کیی خامیوں کے باوجود اس کی ذات کی سب سے بڑی کشش اس کی سچایی ہے سفاک سچایی

!!اس کے جذبے سچے ہیں محبت ہو یا نفرت

وہ سب کے دکھ سنتا ہے اور بڑے پیار کے ساتھ سنبھال کر رکھ لیتا ہے۔ پھر اپنی یادداشت کی پٹاری سے انہیں نکال کر خلوص مٰیں بھگوتا اور مرہم بنا کر زخموں پر رکھتا جاتا ھے۔

شاید اسی مسیحایٔی کا شوق اسے ہومیوپیتھی کی جانب لے گیا۔ دنیا جہاں سے کتابیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا۔ اللہ کے نام پر علاج شروع کر دیا۔ اب دوستوں، یاروں اور غرض مندوں میں دعا اور دوا دونوں بانٹتا ھے۔

میگنٹ ممتاز مفتی

" اب چلو بھی رک کیوں گییں ؟"صباح مفتی کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہویی محسوس ہویی۔ میں اوردھوپ شیشوں سے چپکی کھڑی تھیں، حیران ششدر۔ فیروزی قالین پر ایک چھوٹا نمدہ نمارگ بچھا تھااور وہ source of energy موجود تھا جس سے ہم دونوں ہی خایف تھیں۔ میں اپنی کم مایگی کی وجہ سے اور دھوپ شاید اس شعلے کی حدت کو محسوس کرتے کرتے ٹھنڈی پڑرہی تھی۔ شیشے کا دروازہ کھلا ہم دونوں نے قدم بڑھایے۔ سفید بالوں کی ٹوکری اٹھایے ایک سر اوپر اٹھا" ارے یہ ہیں ممتاز مفتی "؟ مجھے مایوسی سی ہویی۔۔ تعارف ہوا مفتی جی آٹھ کر صوفے پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیے۔ میں سامنے والے صوفے پر ٹک گیی۔ ایک ٹین ایج طالبہ، ایک نو آموز لکھاری کے طور پر۔ ان کی آنکھوں میں معصوم سا تجسس تھا۔ ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ بچوں والی جو curiosity کسی نیی چیز کو دیکھ کر چھلکتی ہے "تو آپ مجھ سے متاثر ہیں سیکھنے آئی ہیں"؟ لہجہ شوخ تھا مگر تکبر کے بغر۔ میں نے بے اختیار کہا "نہیں"۔ ایک عجیب سی چمک ابھری آنکھوں میں "بس آپ سے ملنا چاہتی تھی لبیک پڑھنے کے بعد "وہ مسکرایے چہرے پر مزید چمک آیی،۔ پھر وہ چمک بڑھتی چلی گیی۔ فیروزی قالین، سنہری گراموفون، دیوار پر لگی مفتی جی کے مجسمے کی تصویر۔ سب کچھ ایک جھماکے کی نذر ہو گیا، جن بوتل سے باہر آ چکا تھا۔ الفاظ کی جذبوں کی جنوں کی ایک پھوار تھی۔ میں بھیگتی رہی سکڑتی گیی حتی کہ زمین سے جا لگی۔ مڑ کر دیکھا تو دھوپ بھی فرش پر رینگ رہی تھی۔ "میگنٹ ایکٹو" ہو چکا تھا۔ (اس ملاقات اور پھر مرے بارے میں خاکہ مفتی جی کے قلم سے ان کی کتاب "اوکھے تے آولڑے "میں " بلبلے "کے عنوان سے موجود ہے جو انہوں نے میری کتاب "سچے جھوٹ "کیلئے لکھا تھا (تب میں شہابہ گیلانی تھی ۔۔

مفتی جی کے وجود میں چھپے مقناطیس کے حصار میں جو بھی آیا بچ نہ سکا۔ تھوڑا زیادہ متاثر ضرور ہوا۔ کسی کو لکھاری نے پریشان کیا، کوئی نفسیات دان کے ہاتھوں چت ہوا۔ کوئی ہومیوپیتھک کا اسیر ہے تو کوئی سادھو کے چرنوں میں بیٹھا مست جھوم رہا ہے۔ دن رات عجب تماشا ہے۔ سبھی لوہ چون کی مانند مقناطیس کی جانب کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر تو بوکھلائی رہی، پھر میں نے بھی گرو مرشد کا نعرہ لگایا اور 'متاثرین ممتاز مفتی' میں شامل ہو گئی۔ عجب کہانی تھی اسلام آباد کے برگ ٹایپ سیکٹر کے ایک گھر میں ایک سادہ سے بیڈ روم میں ایک بظاہر انتہائی بیکشش، بےترتیب سا شخص بستر پر ہو اور اس کے گرد ہر عمر ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا میلہ لگا رہتا ہو۔ خاص طور پر خواتین اور لڑکیوں کا۔ یہ مفتی جی کا "ڈھابہ" تھا۔۔

بہت کچھ کہا گیا، مفتی جی کی گوپیوں کے قصے، ان سے دور رہنے کے اشارے۔ احساس ہوا کچھ تو ہے کہ رکاوٹیں define کرنے کھڑی کی جا رہی ہیں۔ شاید گزر جانے یا پہنچ جانے کا خدشہ ہے؟ سو خود دریافت کی ٹھانی۔ انہیں کی کوشش کرتی ہوں تو کوئی خاکہ کوئی ہیولا بن نہیں پاتا۔ بس روشنی کی لہروں کا ایک سیلاب ہے جس نے میری روح کا احاطہ کر لیا۔۔ ان سے میری وابستگی کی شدت آج بھی وہی ہے۔ مجھے مفتی جی پر کوئی تحریر لکھنا مشکل ہو جاتی ہے۔ شاید اس لئے کہ محبت اور عقیدت میں تول کے ترازو بیکار جاتے ہیں۔ تجزیے انصاف وغیرہ یہاں کام نہیں آتے۔ عقیدت والی آنکھ پر پردہ ہوتا ہے۔ جس سے محض اجالا ہی چھن چھن کر آنکھ تک پہنچتا ہے۔ مفتی جی تو میری سہیلی میری ماں میری بہن اور مرے گرو تھے۔ ان کے بعد بھی اس گھر پر ان کا وجود چھایا رہا۔ وہ گیٹ، وہ لان، وہ فیروزی قالین، وہ جگہ جہاں دو مور گھومتے تھے اور مفتی جی چارپائی ڈال کر دھوپ سینکتے تھے سردیوں میں۔ وہ پلنگ جس کے ساتھ قدرت اللہ شہاب کی تصویر تھی، سب کچھ بدل گیا۔ لیکن جانے کیوں آج بھی وہ راستہ۔۔ وہ گھر اس کی ہر اینٹ میرے گرو کی جکڑ میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایسے ہی تھے کسی radiation کے ذریعے جکڑ لینے والے۔ گوشہ نشینی میں بھی نمایاں۔ خود کو سمیٹنے کی کوشش میں پھیلتے جاتے۔ ایک طلسم تھا جس کا فسوں آج بھی قایم ہے۔ اپنے افسانوں میں جس نرتکی کا ذکر کرتے رہے، وہ نرتکی کہیں خود ان کے

اندر چھپی بیٹھی تھی۔ سب کو لبھانے کے ڈھنگ سے واقف وہ مردانہ جسم عورت کے خمیر سے گوندھا گیا تھا ۔عورتوں کے رازدار، کلیسا میں ایستادہ کنفیشن کارنر، ایسا سیاہی چوس جو ہر سیاہی اپنے اندر جذب کرلے۔۔ ہر دکھ ۔۔۔ بانٹ لے پر اس کے آنسو کب بہتے ہیں کس کے آگے بہتے ہیں؟ شاید کوئی نہ جان پایا

یادوں کی پٹاری میں ڈھیروں رنگ برنگی کترنیں ہیں کسے دیکھوں کسے چھوڑوں؟

لبیک 'میں بتایی گیی کالے کوٹھے والے کی ادا مفتی جی نے بھی تھوڑی سی اپنالی تھی۔ ہر ذات کی انا کو غبارہ بنا کر پھلا ' دیتے، چھت سے لگا دیتے۔ ہر کوئی ان کے "ڈھابے" سے یہی گنگنا تا نکلتا 'میں ہی ہوں بس میں ہی ہوں"۔ اپنی ذات کی گڑوی سے کالا پن نکال نکال کر سب کو دکھانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کسی اجلے پن کو چھپانے کی ناکام !!!کوشش میں شاید؟

یہی سب کچھ انہیں ممتاز کرتا ہے۔ جبکہ کیی دوسرے ستایش کے شیرے میں لتھڑے خود ہی اپنے وجود کو چاٹ چاٹ کر ایک ہی مقام پر رک گیے یا مٹ گیے۔ مفتی جی عورتوں کی سہیلی تھے۔ ان کے اندر ممتا میں لتھڑی ایک بھرپور ماں زندہ تھی۔ ان کی ذات پر اپنی ماں کے دکھوں کا عکس بہت گہرا تھا، جس کا اظہار "علی پور کا ایلی" میں موجود ہے۔ عورت کے زخموں کا ادراک تبھی ہوا انہیں، عورت سے ہمدردی کا بیج اسی زمانے میں ان کے دل میں پھوٹا۔ وہ دھیرے دھیرے ہر دل کے زخموں کو ممتا کے مایکروسکوپ میں دیکھ کر انسانیت کے ٹانکے لگاتے اور خلوص کا مرہم رکھتے جاتے۔ ان کی اس محبت اس خلوص کو بہت سے ادبی بونوں نے کیش کیا اپنے قد بڑھانے ۔۔۔ کو

" مفتی جی اور قدرت اللہ شہاب کے باہمی تعلق پر میری ان سے بحث رہتی تھی۔ میرا موقف تھا

شہاب صاحب ایک کور سٹوری ہیں، شہ سرخی ہیں، خبر کی جانب اشارہ۔ اصل خبر اصل کہانی تو وہ ہے جو خود ہیں جو آپ sponge بظاہر کیچڑ میں لت پت،۔ کیچڑ سے بھرے وجود صاف کی ? جا رہا ہے۔ شہاب صاحب تو وہ " کی شدت کو جذب کرتے رہتے ہیں

r مفتی جی کا سفید بالوں بھرا سر متواتر "نہ "میں ہلتا رہتا لیکن ان کی آنکھوں میں لپکتی آگ کچھ اور

ہی کہتی۔ بقول کچھ لوگوں کے مفتی جی شہاب صاحب کے پروموٹر تھے۔ نہیں! وہ تو خود کو چھپانے کی کوشش میں تھے، دھیان بٹا رہے تھے سب کا، الایو کی تپش سے گبھرا کر سب کو ٹھنڈے پانیوں کی جانب دھکیل رہے تھے۔ پر شعلے تو شعلے ہیں جس کا دامن پکڑ لیا سو پکڑ لیا۔

لکھاریوں کے کردار، سبھی ان شعلوں genuin ان کی تحریریں ان کی کہانیوں کے کردار، ان کے گرد بکھرے میں گھرے نظر آتے ہیں۔ کہیں جسم جل رہا ہے تو کہیں روح۔ کہیں انسانی محبت بخار بنی ہے تو کہیں الل ? میاں روگ بنا چمٹا ہے۔ ہر جانب بھڑکن تھی تپش تھی۔ جس نے انہیں بے قرار رکھا اور ان کے چاہنے والوں کو حرارت بخشی

جن دنوں بہت بیمار تھے میں نے کہا "اللہ آپ کو صحت دے "تو فورا بولے

" آنکھوں کی مخصوص چمک کے ساتھ "کڑیے میں وں بد دعا نہ دے " پھر بات بدل دی "ہن رج گیا وان ایتھوں

۔ میں نے کہا' آپ کے چاہنے والے تو نہیں رجے آپ سے 'تو بات ٹال گیے

زندگی کی دعا بد دعا کیوں تھی ان کیلئے ؟ یہ تو تب سمجھی جب ان کیا انتقال پر وصیت کے مطابق قوالی کا انتظام تھا "وصال "کی خوشی میں

بہت سال پہلے ان پر ایک خاکہ لکھا تھا جو 'نوائے وقت' کے ادبی صفحے پر چھپا تھا "اسی سالہ بچہ ممتاز مفتی "گمان تک نہ تھا کہ تیرہ سال بعد یہ بچہ بوڑھا ہو کر سب کو خوشیاں منانے کا کہہ کر چل پڑے گا۔ جانے کیا

گر تھا اس گرو میں کہ ان کے بعد کوئی اس مقام پر جچتا ہی نہیں

مجھے یاد ہے مفتی جی نے "الکھ نگری" صباح کے ہاتھ یہ کہہ کر بھجوائی "لے شہابہ دے متھے مار جاکے "(میرا پید ایشی نام جو بدل چکا ۲۰۰۱ میں)

انہیں معلوم تھا شاید کہ "متھے" ہی لگالوں گی۔ وصولی کے بعد میں نے فون کیا کہ اس کتاب کو ایک ہی رات میں 'پڑھ ڈالوں گی کہنے لگے "توں اینوں چھلیں گی پڑھیں گی نیں "میں نے کہا "گھوٹ گھوٹ کر بوند بوند پیوں گی

میں گم رہی۔ جانے کیسے راستے تھے lybrinth پھر ہوا یوں کہ چار دن اور چار راتیں میں لگاتار الکھ نگری کے گول چکر زینے موڑ، میں چلتی رہی کوئی مجھ سے باتیں کرتا رہا مسلسل انہونی سی، کھری کھری، رنگین، سادہ۔ کبھی سرگوشیاں کبھی نعرے کبھی اوٹ سے کبھی سامنے آکر۔ میں ایک سحر میں تھی "الکھ نگری" مجھ سے مخاطب تھی اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا تو اس سے انگلی چھڑا کر ادھر ادھر تاکنے لگتی۔ لیکن پھر کوئی میرا ہاتھ تھام لیتا اور میں پھر "الکھ نگری" کے لئر نتھ میں کھو جاتی۔ کچھ ایسے ہی احساسات تھے جب میں نے مڈل کلاس میں "لبیک" پڑھی تھی۔ نہ شعور تھا نہ سمجھ۔ بس کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، جنوں تھا "لبیک" نے بہت رلایا تھا اس وقت، آج بھی رلاتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر شدّت سے خواہش کی تھی کہ ان دونوں ہستیوں سے ملوں۔ کوئی قبولیت کی گھڑی تھی کہ دونوں سے ملی بھی بہت کچھ سیکھا اور بھرپور توجہ بھی حاصل ہوئی "لبیک" بذات خود ایک ایسا لفظ ہے ایسا عمل ہے جو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے، ہڈیاں چٹخا دیتا ہے، روح کی گت بنا دیتا ہے، اندر باہر چھینٹ کر رکھ دیتا ہے

"الکھ نگری" ختم کر کے ملی تو میں نے کہا "مفتی جی یہ کتاب آپ کا ماسٹر پیس ہے"

بچوں سی اپنی مخصوص قلقاری کے ساتھ بولے "تمہارا کیا خیال ہے اب میں مر جایوں گا"؟

"میں نے کہا" اللہ نہ کرے لیکن شاید اب آپ ایسی کتاب دوبارہ نہ لکھ پائیں

وہ اچانک ہی خاموش ہو گیے اور موضوع بدل دیا

میری خوش قسمتی کہ قدرت اللہ شہاب کی لایبریری میں اس وقت ان کے پاس بارھا بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جب وہ "شہاب نامہ "لکھ رہے تھے اور یہ بھی اصل میں مفتی جی ہی کا فیض تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں پاکستان کے حوالے سے بات ہو رہی تھی، میری ٹین ایج تھی اور جذباتی پن زیادہ تھا، شہاب صاحب کہنے لگے "بیٹا کیوں پریشان ہوتی ہو جس نے یہ ملک بنایا ہے وہی اس کی حفاظت کرے گا" میں نے پوچھا، "آپ اتنے پر یقین کیسے ہیں،"؟ تو مسکرا کر اپنے دھیمے انداز میں کہنے لگے، "اس لئے کہ پاکستان امام مہدی کی سیٹ بننے کو قایم ہوا ہے" میرے لئے تو بہت بڑا انکشاف تھا۔ مفتی جی کے پاس پہنچی، ساری بات بتای۔ خلاف امید مفتی جی گم سم سے ہو گیے سوچ میں پڑ گیے۔ بستر پر دراز انہوں نے نظریں چھت پر جمالیں۔ پر اسرار گھمبیر لہجے میں بولے "پتہ نہیں اللہ جانے کہتے تو مجھے بھی یہی ہیں "

اس کے بعد ہزار کوشش کے باوجود میں ان دونوں سے مزید کچھ نہ اگلوا سکی۔ ہاں البتہ "الکھ نگری" میں کالا شاہ کاکو والے بابا کی مفتی جی سے باتوں کی تصدیق شہاب صاحب نے ایک بار ضرور مرے سامنے کی تھی۔ پھر بہت سے ذاتی مشاہدات سے اندازہ ہوا کہ یہ دونوں 'بابے' اور ان کے معاملات عقل اور دنیاداری کی حدود سے پرے ہیں۔

منافقت سے پاک مفتی جی کے بارے میں کچھ معصوم ناسمجھ ایسے الفاظ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔ کیا کہیں افسوس ہوتا ہے۔ مفتی جی کو "ٹھرکی" بھی کہا گیا۔ اگر عورت کو اس کی "اپنی اور حقیقی "صلاحیتوں کا احساس دلانا" ٹھرک' ہے، اسے سراہنا ٹھرک ہے، اسے معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کی ترغیب دینا

ٹھرک ہے تو مفتی جی کو سلام۔ شاید لوگ انہی سے خوش ہیں جو صرف راتوں رات شہرت کی شوقین خواتین کو چند حروف لکھ کر دیتے ہیں واہ واہ کرواتے ہیں"۔ قیمت" وصول کرتے ہیں اور جلد ہی دوسری "گاہک" پر توجہ کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کی عقل جسم کیجال سے باہر دیکھ ہی نہیں سکتی۔ مفتی جی سے ۱۳ برسوں کی فیضیابی، ان کے گھ میں بیٹی کی حثیت سے، ایک مقام نے مجھے بہت کچھ سکھایا اور ان کے بارے میں سمجھایا۔ وہ ہر عمر ہر شکل ہر ذہن کی عورت کے اندر کے کومپلکس کو باہر لانے کی کوشش کرتے تھے، ایک دوست ایک نفسیات دان کی طرح کہ انہوں نے انگریزی اور نفسیات میں ایم اے کیئے ہوئے تھے۔ کچھ ان کے بچپن کا رد عمل تھا انہوں نے اپنی ماں کو ہمیشہ ایک ستی ساوتری کے روپ میں دیکھا جو خاوند کے ہر ظلم کو سینے پر اعزاز سمجھ کر سجاتی رہی، خود کو کمتر سمجھتی رہی۔ مفتی جی کو شاید اس مظلوم کردار سے چڑ تھی" علی پور کا ایلی" میں یہ کش مکش یہ بغاوت، ایلی کا کردار واضح کرتا ہے۔ جو باپ کی دوسری بیوی سے اور باپ سے بیک وقت متاثر بھی تھا اور نفرت بھی کرتا تھا۔ شہر زاد کے لئے ایلی کا پاگل پن

اس لیے تھا کہ وہ ایک 'زندہ "عورت تھی۔ اپنے وجود

اپنی

خواہشوں اپنے خوابوں میں زندہ رہنے والی عورت، جسے مظلوم کہلوانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ مفتی جی نے اپنے گھرانے میں اپنی بیوی، بیٹیوں حتی کہ بہو کو بھی وہی حقوق، وہی احترام، وہی عزت دی جو کسی بھی ذی روح کو انسانیت دیتی ہے۔ مفتی جی کے افسانے عورت کو بحیثیت انسان ہی ٹریٹ کرتے ہیں۔ حوصلے والی بہادر عورت

ان کی آئڈیل ہے"۔ ان کی تحریروں میں عورت کو نفسیاتی انداز میں ٹریٹ کیا گیا ہے۔ اس کی آنا، اس کے مقام کو بلند کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ یہاں صرف چند حو

الے دینا چاہوں گی

گڈی کی کہانی" کے کچھ افسانوں کے کچھ حوالے مرے نکتہ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ افسانہ کند، انوولومنٹ، منیر" اور منیرہ، گنگو، عورت ذات کے اندر اتر کر سوچی سموچی کہانیاں ہیں جو میرے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ مفتی جی کا باطن عورت کے خمیر سے گوندھا گیا تھا۔ عورت کی روح کو پرت پرت مثبت انداز میں کھنگالنا اس کی ' گہرائی تک جانا عام مرد کے بس کی بات نہیں

" گنگو

سلطانہ نے حقارت سے اس کی ہوس سے پھولی ہوی آنکھوں کی طرف دیکھا، اس کے لٹکے ہویے " ۔۔۔۔۔ ہونٹوں سے گویا رال ٹپک رہی تھی، سلطانہ کی نگاہ کی گرمی سے وہ تلملا اٹھا اور کیڑا بن کر رینگنے لگا کیوں؟ سلطانہ " کے دل کی گہرایوں سے چیخ اٹھی کیوں وہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ محبوب ہوتے ہیں؟

اسی طرح "انوولومنٹ" ایک تسشنہ روح کی داستان ہے جسے جسم کے صحرا میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا، " بیگم جاہ کی پرسنالٹی اللہ کی دین نہ تھی جو بن مانگے ملتی ہے۔ اس نے زندگی بھر مسلسل محنت سے ایک ایک اینٹ چن کر اپنی پرسنالٹی کا ابوالہول تعمیر کیا تھا۔ شادی کے بعد اس کے سر پر ایک دم بیگم بننے کی مصیبت آن پڑی تھی اور بیگم بننے میں نسایت حایل تھی، بری طرح حایل تھی۔ چونکہ نسایت تو خاص انویلومنٹ ہوتی ہے اندھی انوولومنٹ، ں " سایت کو چھپانے اور رد کرنے میں بیگم جاہ کو بہت محنت کرنا پڑی تھی

یہ اقتباسات میں نے اپنے خیالات کو بریک لگانے کو بیان کیے ورنہ شاید میں لکھتی چلی جاتی

مفتی جی پر لکھنا بہت مشکل بھی ہے اور آسان بھی، کم از کم مرے لئے

شفقتوں کا سائبان۔۔۔قدرت اللہ شہاب

ایک صبح آفس پہنچی تو یونہی ڈایری کے صفحے پلٹنے لگی۔ ذہن پر بوجھ سا تھاِ، سامنے نظر پڑی قدرت اللہ شہاب لکھا تھا اور ساتھ ہی ان کا ٹیلی فون نمبر۔

میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

شہاب صاحب! میں نے جب یہ نمبر لکھا تھا تو نہ جانے کیوں یہ احساس تھا کہ آپ ہمیشہ ساتھ رہیں گے آپ لافانی ہیں۔ جانے کیوں لگتا تھا کہ آپ اس فانی دنیا کا حصہ نہیں ہیں

۔کویی فرشتہ ہیں جو آسمان کی بلندیوں کو چھوڑ کر زمین پر آن بسا ہے۔

دکھی دلوں کا مداوا بن کر۔

دنیا تو آپ کو جانے کن کن حوالوں سے جانتی ھے۔ کویی آپ کو بہت بڑا سرکاری افسر کہتا ھے تو کویی اللہ کا ولی مانتا ھے۔ کویی بہترین دانشور کی حیثیت سے جانتا ھے تو کویی بہترین انسان مانتا ھے۔

آپ ہی بتایں اتنی ساری خوبیوں کا مالک لافانی نہ لگتا تو کیا لگتا؟

میں تو آپ کو اپنے حوالے سے جانتی ہوں، ایک ایسے احساس کے حوالے سے جو کسی اور سے نہ مل سکا۔

سمجھ میں نہیں آرہا آپ کی کون کون سی بات یاد کروں؟ کس کس لمحے کو آواز دوں؟ ابھی کل ہی کی بات لگتی ھے ،میں مفتی جی سے ضد کر رہی تھی کہ مجھے شہاب صاحب سے ملوایں۔

""مفتی جی کہنے لگے، "اپنا نام بدلو پہلے اچھا لگتا ہے بھلا کہ میں شہاب سے کہوں آپ سے شہابہ ملنا چاہتی ھے

''اچھا تو پھر میں خود ہی مل لوں گی ''

اور پھر پہلی بار خود کو آپ کے نورانی وجود کے روبرو مفتی جی کے ہاں ہی پایا تھا۔ اشفاق احمد اور بانو آپا اسلام آباد آیے ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں مفتی جی کے گھر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔

!! شیشوں کے پار باہر رات کی ٹھنڈک تھی اور ڈرائینگ روم کے اندر جذبوں کی گرمی

خوبصورت لوگ، خوبصورت ذہن اپنی باتوں سے ماحول کو سحر زدہ کیے ہوئے تھے۔

اور آپ، شہاب صاحب بڑی انکساری کے ساتھ صوفے کے ایک کونے پر ٹکے ہوئے تھے۔ نورانی معصوم چہرہ، سادہ سی شلوار قمیض گلے میں لپٹا ہوا اونی مفلر۔ مجھے لگا میں کسی نورانی ہالے کی زد میں آ گیی ہوں۔

عجیب سا احساس، اتنا اثر کہ میں براہ راست بات کرنے کی جرآت نہ کر سکی۔ مفتی جی نے تعارف کروایا، آپ نے !ایک شفقت بھری نظر ڈالی اور جانے کیا ہوا کہ میں سلام بھی نہ کر سکی، بس دیکھتی رہی

چند دن بعد فون کیا کہ ملنا چاہتی ہوں۔ آپ نے اتنے پیار سے خوش آمدید کہا کہ اسی دن ملنے پہنچ گیی۔

پھر میں ملتی رہی، جذبوں کی پھوار میں بھیگتی رہی، محبتوں شفقتوں کے خزانے لوٹتی رہی۔

ذرا ڈپریس ہوتی تو آپ کے پاس پہنچ جاتی۔ اپنی سٹڈی میں اکثر سفید کرتا شلوار میں ملبوس ایزی چیر پر بیٹھے اپنے مخصوص دھیمے دھیمے نرم لہجے میں ڈھیروں باتیں کرتے۔

میں خاموشی سے سنتی رہتی، اتنے پیار، اتنی شفقت سے مشورے دیتے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

شہاب صاحب جب دنیا کی نفسا نفسی دیکھ کر انسانیت سے اعتبار اٹھنے لگتا ھے تو آپ کی باتیں اسے پھر سے بحال '' ''کر دیتی ہیں

یہ سن کر آپ مسکرا دیتے اور ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کی تلقین کرتے۔ میری شاعری اور نثر دونوں کو سراہتے اور لکھتے رہنے کی نصیحت کرتے۔

پچھلے دنوں کسی نجی مسلے کی وجہ سے پریشان تھی۔ مفتی جی نے کہا کہ خوامخواہ خوار ہو رہی ہو شہاب سے ملو کوئی نہ کوئی حل نکل آیے گا۔ میں نے آپ سے مل کر ذکر کیا آپ بے حد سکون کے ساتھ سنتے رہے پھر چند دعائیں بتائیں، ساتھ ہی سمجھایا،

" ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے اپنی کوشش جاری رکھیں "

چند دن بعد آپ کو خواب میں کچھ تحریر کرتے دیکھا، خواب ہی میں استفسار پر بتایا کہ لوگوں کے حالات زندگی لکھ رہاھوں۔

" میرے مزید پوچھنے پر جواب دیا، "جو آپ چاہتی ہیں وہ نہیں ہو گا مگر بہتر ہو گا

میں اداس سی ہو جاتی ہوں لیکن آپ کی نگاہوں میں کچھ ایسی چمک ہے کہ میرے دل و دماغ سکون کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

اگلے دن آپ سے اس خواب کا ذکر کیا تو بہت پیاری نرم سی مسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل گیی۔ میرا دل آپ ہی آپ مطمین سا ہو گیا۔

مفتی جی اکثر کہتے، "شہابہ تم میں کیا چلتر ہے کہ شہاب جیسے بندے نے تجھے اتنی جلدی قبول کر لیا اور اپنے قریب آنے دیا میں تو بڑا حیران ہوں"

میں اس عنایت پر اللہ کا شکر ادا کرتی، اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوتی۔ مفتی جی آپ نے نظر لگا دی میری قسمت کو !

شفقتوں کا سایہ یاں بہت جلد چھن گیا۔ ابھی تو جلتی دھوپ میں بہت طویل سفر باقی تھا، اب کون مجھے اپنی نورانی نرم مسکراہٹوں میں بھگوئے گا؟ کون میری پیاسی روح کو مذہب، انسانیت اور ہدایت کے چشمے سے سیر اب کرے گا؟ کون میرے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو سہارا دے گا؟

جدائی کی ساعت سے چند گھنٹے پیشتر بھی تو آپ سے بات ہوئی تھی۔ آپ نے لاہور کے دورے بارے بتایا۔ میں نے طبیّعت کا پوچھا تو کہنے لگے، ''میں تو ٹھیک ہوں البتہ بانو کی فکر ہے مجھے وہ بیمار ہیں، بس چند دن سے میرے پایوں میں درد ھے''

میں نے کہا، ''اب تو نفسیاتی درد ہوں گے بیٹا جو ڈاکٹر بن گیا ہے'' تو کھل کر ہنسے۔

مجھے کیا خبر تھی کہ یہ آخری درد ہے، پھر آپ کبھی کسی درد کی شکایت نہیں کریں گے۔

باتوں کے دوران ہی کہنے لگے کہ آپ لکھتی رہنا اپنا قلم کبھی نہ چھوڑنا اس میں بڑی طاقت ھے۔

اب سوچتی ہوں شاید آپ کو معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟

ہاں آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ملنا ہے تو آج شام آجایو اور میں نے جمعے کی صبح آنے کا وعدہ کیا تھا۔

تو پھر آپ نے میرا انتظار کیوں نہ کیا؟ میں تو آئی تھی حسب وعدہ مگر آپ ہی نہ تھے۔ آپ تو سب کو سسکتا چھوڑ کر اتنی دور چلے گیے تھے کہ صدائیں بھی دم توڑ گیی تھیں۔

''آپ نے یہ بھی نہ دیکھا کہ مفتی جی گلہ کرتے رہے، ''شہاب سینیارٹی کا تو خیال رکھتے مجھے پہلے جانے دیتے

آپ نے تمام عمر محبتوں اور شفقتوں کی چادر سب پر تانے رکھی مگر اک ذرا سا دل کے کہنے پر سب سے بے نیاز ہو گیے؟ آپ نے بہت زیادتی کی ہے بہت دکھ دیا ہے۔ یا شاید میں غلط سوچ رہی ہوں؟

آپ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے، ”ہر کام میں خدا کی مرضی ہوتی جو وہ جانتا ھے ہم نہیں جانتے۔

“اپنی کوشش کے بعد اس کے فیصلے پر سر جھکا دینا چاہیے۔

!! میں نے بھی آنکھیں موند کر آنسو پونچھ لیے ہیں اور خدا کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا ہے

بلاوہ۔۔۔۔

کسی تقریب کا بلاوہ ہو تو دنوں نہ سہی گھنٹوں پہلے تیاری شروع ہو جاتی ھے۔ یہ سوٹ کیسا رہے گا؟ کپڑا برھیا تو ھے نا، یہ جوتے یہ میک اپ سب ٹھیک ھے نا؟ اور جانے کیا کیا لوازمات! اکثر لوگوں کو آخر دم تک تسلی نہیں ہوتی۔

! مگر یہ کیسا بلاوہ تھا؟ نہ سر کی ہوش نہ پیر کی فکر

بس پہنچنا تھا، جانا تھا کہ چلتے چلتے جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں ننگے سر ننگے پاؤں، اب صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا۔

مگر ٹھہریں ذرا آپ کو بتاتی چلوں یہ کہانی کب شروع ہوئی۔ سکول میں پڑھتی تھی تو 'لبیک' ہاتھ لگی۔ دماغ میں پڑھنے لکھنے کا کیڑا ہمیشہ سے تھا۔ لبیک کے ہر صفحے ہر سطر پر آنکھیں نم ہونے لگیں۔ یا اللہ شعور کی یہ کونسی منزل ہے؟ یہ تو خوابوں کے، سنہرے رنگوں کے مسکانوں کے دن ہیں۔

!یہ پلکیں کیوں بھیگنے لگیں اور وہ بھی دو بابوں کے ذکر پر؟

ایک لکھ رہا ہے دوسرا لکھوا رہا ہے۔

لکھنے والا ممتاز مفتی اور لکھوانے والا قدرت اللہ شہاب۔

!ایسے ہی من چاہا ان دونوں سے مل پایوں کبھی

جانے کونسی قبولیت کی گھڑی تھی کہ ان دونوں بابوں سے ملی اور ایسے ملی کہ زندگی کچھ عجیب سے رنگ میں رنگی گیی۔

! نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی

خیر قلم چلتا رہا۔

ایک دن اچانک ہی اپنے ایک یونیورسٹی فیلو کے زریعے مفتی جی سے ملنے کی سبیل نکل آیی۔ انہی کے پاس شہاب صاحب سے بھی ملاقات ہو گیی۔

پھر تو جانے طوفان آیے، آندھیاں چلیں، کیا ہوا کہ میری ذات میری زندگی رویی کی مانند دھنکی جانے لگی۔ آزمایشوں کا، خوابوں کا، بنتے مٹتے نقوش کا جو سلسلہ چلا تو آج تک رکا نہیں۔

جولائی ۱۹۸٦ میں شہاب صاحب کے وصال کے کچھ عرصہ بعد خوابوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر مفتی جی بھی چلے گیے۔

زندگی اسی طرح بھنور میں رہی، کبھی تنکا، کبھی چٹان، کبھی پتہ، کبھی درخت، کبھی ندی، کبھی سمندر، کیی بہروپ بدلے بانوری نے، کیی دیسوں کی خاک چھانی۔

پھر اچانک کیی سال بٌد ایک فون کال نے ٹوٹے سلسلوں کو جوڑ دیا۔

دہلی میں ہونے والی لکھاریوں کی سارک کانفرنس کا بلاوہ تھا۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گیی۔ شہاب نامہ کے اوراق نگاہوں کے سامنے پھڑ پھڑانے لگے ۹۰، تکیے کے نیچے پرچیاں، انگریزی میں پیغامات !!

دہلی کنکشن ؟

کیا یہ وہی دلی ھے جہاں ۲۲ عظیم صوفیا کی درگاہیں ہیں، جہاں لال قلعہ کی دیواروں پر مسلمانوں کا عروج نقش ہے ؟

جہاں انگریزوں نے ۱۸۵۷ کے بعد اسی لال قلعہ کے فرش شاہی خون سے رنگ دیے !

وہی دلی جہاں شہزادے شہزادیوں کے بدن دریدہ ہویے ؟

جہاں محبت کی ہر حسین یادگار کو مٹا کر نفرت کے پتھر چن دیے گیے۔

جہاں نظام الدی اولیا کا فیض آج بھی جاری ھے اور جہاں میرے گرو مرشد کے مرشد مجھے بلا رہے ہیں خواجہ بختیار کاکی رحمت اللہ علیہ!

پتہ نہیں کیوں مجھے خوش فہمی ھے کہ یہ کانفرنس تو بہانہ ھے۔ بلاوہ انہی کا ہے یا دراصل سمن ہے میرے نام کا۔

بہت دور نکل گیی تھی نا، باگیں موڑنا چاہتے ہیں میری۔

کانفرنس ختم ہویی میں تسلی سے اکیلے گھومنا چاہتی تھی سو پرانی دلی میں دریاگنج کے قریب ایک گیسٹ ہاوس میں کمرہ لیا اور لگی سڑکیں ناپنے۔

بازار کی چہل پہل میں انسانی رکشہ وہاں پہلی بار دیکھا یونہی ایک پر سوار ہویی۔ جسے ایک مدقوق سا مسلمان کھینچ رہا تھا۔ غربت اور بیماری اس کے انگ انگ میں ہانپ رہی تھی۔ اس جیسے کیی انسانی رکشا میرے داییں باییں سے گزر رہے تھے۔ میں نے چند قدم کے بعد رکشہ رکوایا اور اتر گیی۔ جانور کی جگہ جتے ہوے اس انسان کے چہرے پر مایوسی پھیل گیی۔

میں نے کچھ رقم اس کے ہاتھ پر رکھی اور اتنا ہی کہہ سکی۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا معاف کریں جو چند قدم آپ پر بوجھ ڈالا اپنا اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ رکشے والے کے چہرے پر شدید حیرت تھی۔
آپ پاکستان سے آیی ہیں کیا؟

" میں نے کہا، "ہاں بھایی اور وہاں انسانی رکشا نہیں چلتا

اس نے حیرت اور رشک سے مجھے دیکھا، میرے دل میں اپنے پاکستانی ہونے پر عجیب تفاخر اور خوشی کا ایک بھرپور احساس جاگا اس لمحے۔

میں پیدل چل پڑی۔ رواں دواں ٹریفک، ھندو مسلم سکھ عیسایی، امیر غریب ہر کسی کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔ کیا واقعی ہم سب کو پہنچنے کی جلدی ہے مگر کہاں؟

کیاان سب کے بھی بلاوے آ گیے ہیں ؟

کیاان سب کے بھی مرشد ہیں؟ کیا مرشدوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں، روپ ہوتے ہیں ؟

کسی کا مرشد پیسہ، کسی کا نوکری، کسی کا تن تو کسی کا من مرشد!! کیسی ہے یہ دنیا؟ کیوں ایسی ہے یہ دنیا؟

میں نے سبز اور پیلے رنگ کا ایک صاف ستھرا آٹو رکشہ لیا جسے چلا رہا تھا ایک سردار جس کی کمنٹری کی رفتار پھٹ پھٹ کرتے رکشہ سے زیادہ تھی۔ وہاں سبھی بسیں اور آٹو رکشہ سبز اور پیلے رنگ میں رنگے تھے کچھ بسیں لال رنگ کی بھی تھیں۔

دلی میں اس ایک دن یعنی ۲۹ مارچ ۲۰۱۱ پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

ہر سڑک ہر دیوار ہر درخت ہر چہرہ ایک کہانی سناتا محسوس ہو رہا تھا۔

! میرے ابا ہو اجداد کی کہانی تین ہزار سال پرانی کہانی

ہر نیون سائین کے پیچھے سے کتنے چہرے جھلک دکھا کر چھپ جاتے۔

انہی چہروں سرگوشیوں اور ارد گرد پھیلے شور کے سمندر میں غوطے کھاتی جانے کب نظام الدین اولیا کی درگاہ تک پہنچ گیی۔ چند لمحے ساکت سی آٹو رکشہ میں بیٹھی رہی۔ کیا واقعی میں پہنچ گیی ہوں؟

پاگل، پہنچتے تو نصیب والے ہیں شکر کر کہ تیرے قدموں کو چند لمحوں کا بلاوہ ملا جانے کیوں اچانک ہی نگاہیں دھندلانے لگیں۔

انسانوں کا سیلاب، صدیوں پرانی تنگ گلیاں، پھولوں چادروں نذرونیاز کے انبار لگے تھے دورویہ دکانوں پر۔ ہر کوئی بھاگ رہا تھا، ایک دوسرے کو دھکیلتا خوہشات کے بت کاندھوں پر اٹھایے۔ من کی مرادوں کا تھال تھامے !

میں بھی اس دوڑ میں شامل ہو گیی مگر یہ کیا؟ کسی نے راستے میں دامن تھام لیا مجھے بھی تو ملو آن کر !

مجھے مرزا غالب کہتے ہیں !

شاعری کے جادوگر کا یہاں انداز ہی نرالا تھا۔ عاجزی ہی عاجزی نہ وہ طنطنہ نہ بے نیازی !

کویی رتبہ ملا یا نیاز مندی کا کویی انداز، اللہ جانے؟

نظام الدین اولیا کے قرب میں خاموشی اور سادگی کے ساتھ، یوں جیسے اس سارے ہنگامے سے کویی سروکار نہ ہو ۔

جب ایک بوڑھے درخت سے لپٹے ایک باریش شخص نے کہا کہ آج تو مزار غالب بند ہے تو دل بیٹھ سا گیا۔ تبھی ایک صندلی رنگت والی عورت نے اپنی اڑے رنگوں والی ساڑھی کے پلو سے بندھی ایک زنگ خوردہ چابی کی جھلک دکھایی،

پاکستان سے آیی ہو، آیو میں ملواتی ہوں غالب سے تمہیں" لگا کویی جادوگر بڑھیا کسی خزانے کی چابی لے آیی ہو۔ "

تھکے تھکے قدموں اور اداس روح والی اس عورت نے آخر کار مرزا غالب اور ان کے اہل خانہ سے ملوا ہی دیا۔

وہاں حضرت غالب کے ساتھ ہی ان کی اہلیہ اور بچوں کے مزارات بھی تھے مگر تصیل بتانے والا کویی نہ تھا۔ سب چپ تھے قبروں کے کتبوں کی طرح !

ساتھ میں دیوان عروس، جہاں نظام الدین اولیا عوام سے ملاقات کرتے تھے۔ راستے میں امیر خسرو سے بھی ملاقات ٹھہری۔ یا اللہ میرا تو دامن ابھی سے تنگ پڑنے لگا ہے۔ ابھی تو وہ مرحلہ باقی ھے جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔

نظام الدین اولیا کے مزار پر ہر رنگ، نسل اور مذہب کے افراد کا ایک سیلاب تھا جو اُمڈا چلا آرہا تھا۔ قوال جانے کیا الاپ رہا تھا؟ میں تو کچھ اور ہی سن رہی تھی جو تاریخ کے اوراق کہہ رہے تھے۔

یہ دھرتی جہاں امن و آشتی کے علمبردار آتے رہے، محبت کے بیج بویے، دشمنوں کو اپنایا، آگ پانی کا میل کرایا، اسی دھرتی پر الگ الگ وطن بننے کے بعد بھی ہر لمحہ نفرت کی آگ کیوں دہکتی ھے؟

جب اس دربار پر آن کر من کے مندر، مسجد اور گردوارے ڈھے جاتے ہیں تو باہر نکل کر لوگ خانوں میں کیوں بٹ جاتے ہیں؟

اگر بٹ بھی جاتے ہیں تو انسانیت کے رشتے کو کیوں پل بھر میں توڑ دیتے ہیں کسی کی بہکاوے میں آکر؟

! بھلے مسجد میں بیٹھو گردوارے میں یا مندر میں! اللہ، گرو اور رام کا پیغام تو ایک ہی ہے نا؟ امن و آشتی

یہ سوچتے سوچتے لگا میں نظام الدین اولیا سے شکایت کر رہی ہوں لوگوں کی، کسی ناسمجھ بچے کی طرح اور وہ میری ! جانب ایک مسکراہٹ اچھال رہے ہیں جہاندیدہ، برگزیدہ

اپنی کم مایئگی پر میرے آنسو چھلک پڑے جانے کس نے ان آنسویوں کو گلاب کے پھولوں سے پونچھ دیا۔

! شکریہ آپ سب کے بلاوے کا

اب میرے قدم عجیب انداز میں حرکت کر رہے تھے، بظاہر اڑتی جارہی تھی مگر پتھر کے پر لیے! میرا اصؒل میزبان تو شاید کوئی اور تھا، میں تو ایک تقریب میں بلائی گئی ہوں جہاں ہر طرف وی آئی پی تھے اور میں ایک ذرہ بے نام!

کاندھے پر بھاری گٹھڑی اٹھائے خوفزدہ لاچار۔

مجھے اپنے اصل ہوسٹ کی جانب جانا تھا۔ آٹو والا دیدار سنگھ بولے جارہا تھا، میں ہوں ہاں کرتی جارہی تھی۔ اچانک احساس ہوا کہ ہم ایک انتہائی ویران راستے پر آ گئے ہیں، ہر جانب جھاڑ جھنکار، اپلوں کے ڈھیر، بدحال جھگیوں والے اوران کے ننگ دھڑنگ بچے۔ دوسری جانب بدبودار کھائی، جس میں اگے ہوئے صدیوں پرانے داڑھیوں والے خوفناک سے درخت اوران کے بیچ گھومتے سور!

کیا آج بھی دن دہاڑے شہروں میں سور گھومتے ہیں؟ دماغ نے سوال کیا

یہ کم از کم اصلی تو ہیں، دل نے جواب دیا۔

تم تو دن رات ہر طرف ان کی نقل دیکھتی ہو، زیادہ خطرناک، زیادہ وحشی، زیادہ خوفناک،" میں لرز گئی خوف کے" مارے آنکھیں بند کر لیں۔

دیدار سنگھ کی آواز آئی، "بہن جی آ گیا جے مزار بابے دا"۔

سامنے دیکھا تو ایک ویران سا مزار تھا، نہ بندہ نہ بندے کی ذات، ایک پرانا سا کنواں، چند اجاڑ قبریں اور سادہ سا سفید رنگ کا چھوٹا سا مسجد نما مزار، کسی کا اجڑا سا دیار!

کیا یہ دلی کا پرانا روپ ہے؟ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟ میں نے آنکھیں ملیں۔

نظر پڑی مزار کے دروازے پر لکھا تھا 'حضرت شہاب الدین' دھندلا سا خیال آیا یہ تو نظام الدین اولیا کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ لیکن میں تو خواجہ بختیار کاکی سے ملنے آئی تھی؟

پھر شعلہ سا لپکا، ذہن پر کوڑا سا پڑا۔

بے وقوف عورت تو کس سے ملی تھی؟ بختیار کاکی کن کے مرشد تھے؟

تو کن سے ملی تھی؟

قدرت اللہ شہاب۔! اوہ پردہ ہٹ گیا جیسے نظروں کے سامنے سے۔ مجھ کم عقل کو شہاب نام کے ذریعے سمجھایا گیا کہ اپنے واسطے کو نہ بھولنا تو یہاں پہنچی کس کے ذریعے ہے؟ میں کانپ گئی لرز گئی!

''دیدار سنگھ یہ وہ جگہ نہیں ہے کہاں لے آئے ہو،''

دیدار سنگھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا، ''بہن جی تسی آپے تاں مینوں ایس راہ لیا یے او قسم واہگرو دی میں تاں پہلی وار ایہ پاسا تکیا اے'

میرے دماغ کا فیوز پہلے ہی اڑا ہوا تھا، یہ سن کر عجیب حالت ہو گئی بمشکل اتنا کہا، ''خورے میں راہ بھل گئی آں مینوں تے خواجہ بختیار کاکی دی حاضری لیی جانا اے''

" اوہ تاں مہر ولی اچ اے بڑی دور ایتھوں

میں جانااے جھوک سجن دی نال میرے کوئی چلے۔

جانے اس اجڑے مزار کی حاضری کوئی استعارہ تھا یا اشارہ؟ ویرانے میں تنہا مزار پر بظاہر غلطی سے آنا؟ اس کے

! بھید وہی جانے

آخر وہاں پہنچی، وہی پھولوں چادروں مکھانوں والے، وہی کاروبار، وہی خواہشوں کے بت وہی من کی صفائی کی طلب

ہر جانب! میں بھی اس سمندر میں قطرہ بن کر شامل ہو گیی۔

! سادہ سا مزار نہ پھول بوٹے نہ گنبد، سنگ مرمر نہ سنہری حروف

! اپنے مریدوں کے ساتھ ایک احاطے میں محو خواب

احاطے کے گرد دور دور تک سیمنٹ کی سادہ جالی جس سے آگے خواتین کا داخلہ ممنوع تھا۔

میں کتنی دیر تک اس جالی سے لپٹی سسکتی رہی۔ آنسو تھے کہ امڈے چلے آرہے تھے۔ یہاں رکاوٹ تھی نا!

""عورت اندر نہیں جایے گی" دل رو پڑا۔ "اتنی دور سے بلا کر یہ قدغن کیوں لگا دی؟

"شکوہ ہچکیوں میں ڈھل گیا، "آپ کے در پر یہ تخصیص کیوں؟ کس نے یہ دیوار کھڑی کی؟

!!! شکوہ شکوہ شکوہ

دل شکوے کیے جا رہا تھا دماغ نے ڈانٹا۔

"بے وقوف گلے چھوڑ جھولی بھر لے

پتہ نہیں کس جذبے نے بے اختیار کیا، ہوش تب آیا جب کسی نے چادر کا کونہ ہلا کر چند پھول پکڑا دیے اور آگے چلدی میں نے بس ایک ہیولی دیکھا۔

ایکدم ہی جیسے کوی گھنی چھایوں تلے آ جایے۔ دینے والا کسی کی او قات تھوڑا ہی دیکھتا ھے۔ وہ تو بس دے دیتا ہے منت ترلہ کرنے والے کو، کہ وہ تو ہوتا ہی دیالو ہے !

سہارے ہی سہارے!! میں نے بیساکھیاں پرے پھینک دیں، من دھمال ڈالنے لگا!!

پایوں زمین کو چھوڑنے لگے۔

ابو الکلام آزاد 'غبار خاطر' میں لکھتے ہیں،

"مذہب ہی ایک ایسی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے

لیکن ہم سب نے مل کر مذہب کو ایسی دیوار بنا دیا ہے جس پر لہو کے چھینٹے ہیں۔ میں نے سوچا۔

آج اس دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر محسوس ہوا یہ دیوار تو پھولوں سے بنی ہے، محبتوں کی مٹی میں گندھی ہے !

کوی میری دکھتی پیٹھ پر مرہم رکھ رہا تھا، ہولے ہولے مساج کر رہا تھا، سکون رگ و پے میں اتر رہا تھا۔

شہاب صاحب آپ کے ۹۰ کے پاس ہوں آج !

آپ کہاں ہیں؟؟

اصلی نقلی مسکراہٹ

بیگم سرفراز اقبال 'رابطہ' کی ایک ممبر تھیں۔ لکھنے کا کام تو کم کم تھا لیکن لکھاریوں کی شدید مداح لگتی تھیں۔ خاص طور پر مفتی جی کے پاس تو اکثر بیٹھی نظر آتیں۔ وہ فیض کی بھی سنا ہے بہت بڑی پرستار تھیں۔ ویسے ادب نواز مشہور تھیں۔

تب تو ان کی عمر ڈھل چکی تھی، لیکن بڑی طرح دار، خوب بنی ٹھنی رہتیں اور پرکشش لگتیں۔ اونچے اونچے قہقہے ان کی پہچان تھے، لمبا قد اور لمبے لمبے کھلے لہراتے بال۔ ان کا انداز بات چیت کا، چلنے پھرنے کا کھلا ڈلا تھا۔ ہر کسی کے ساتھ گپ شپ چھیڑ چھاڑ، زندگی سے بھرپور!

میں چونکہ سب سے کم عمر اور ہر لحاظ سے چھوٹی تھی 'رابطہ' کے ممبران میں، اس لیے مفتی جی اور منشا یاد کے علاوہ باقی ممبران سے رسمی بات چیت رہی شروع دنوں میں۔ سرفراز اقبال مجھے جب پہلی بار ملیں مفتی جی کے ہاں تو میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگیں "مفتی جی یہ سوھنی سی لڑکی کون ہے"؟

"مفتی جی نے کہا، "بہت اچھا لکھتی ہے بڑی چمک ہے اس میں شہاب کی لاڈلی ہے

میں ہلکا سا مسکرایی یہ سن کر کہ مفتی جی کے انداز میں ایک شرارتی سی وارننگ محسوس ہویی جانے کیوں؟

"۔ سرفراز اقبال کہنے لگیں "پھر تو ہم سب کی لاڈلی ہویی

میں ہنس پڑی یونہی جانے کیوں؟

" مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں، "کڑیے تیرا تے ہاساوی کنا سوہنڑا اے

''مفتی جی نے سر ہلایا، ''پر اہدے ہاسے نال کم کجھ نیں بنڑنا۔ اے کم نیں لے سکدی کسے کولوں

سر فراز اقبال مجھے بہت سراہ رہی تھیں اور میں جھینپ رہی تھی۔ مفتی جی نے محسوس کر لیا اور ان کی توجہ بٹانے کو کہنے لگے،

اس کی مسکراہٹ اصلی ہے دھیمی دھیمی اندر سے نکلتی ہے پر اثر دیر سے کرتی ہے، نقلی مسکراہٹ میں ''
''طرحداری ہوتی ہے، ایک خاص ٹارگٹ ہوتا ہے سو نقلی مسکراہٹ والے کامیاب رہتے ہیں

آج ان باتوں کو یاد کرتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ مفتی جی کیسے مستقبل میں جھانک لیتے تھے؟

وہ دھیمی دھیمی اصلی مسکراہٹ والی، وہ دل سے قہقہے لگانے والی شہابہ واقعی اتنی کامیاب نہ ہو سکی دنیاوی اعتبار سے کہ اس کے پاس نقلی مسکراہٹ نہ تھی!

میں شادی کے بعد نجی اداروں میں بہت اچھے عہدوں پر کام کرنے لگی تو ایک دن مفتی جی نے مجھ سے پوچھا، ''
''شہابہ تیرے اپنے افسران سے کیسے تعلقات ہوتے ہیں

میں نے جواب دیا، ''میں جن اداروں میں ہوتی ہوں وہاں کا مالک ہی مجھ سے بڑا افسر ہوتا ہے براہ راست ہی رابطہ ''ہوتا ہے

کچھ سوچنے لگے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا؟

کہنے لگے، ''اچھا ہے ورنہ میں تمھیں کچھ سمجھانے لگا تھا کامیاب نوکری کے اصول جو میں نے اپنے تجربات سے
''سیکھے بلکہ جن پر میں کبھی عمل نہ کر سکا

''میں نے جواب دیا، ''ابھی تک تو سب ٹھیک ہے ہاں جب کہیں بہت مسلہ ہو گا تو سیدھا سا حل ہے استعفی

کہنے لگے، ''مجھے یہی خوف ہے کہ تم بہت بے خوف ہو، ایسے لوگ ہضم نہیں ہوتے کسی کو یہ ایک مخلوق ہے نا باس نام کی، یہ کسی بھی سطح پر ہو کانوں کی کچی اور خود کو عقل کل سمجھنے والی ہوتی ہے۔ اپنے سے زیادہ سمجھ والا بندہ انہیں اچھا نہیں لگتا''

''میں نے کہا، ''ویسے تو میں کہاں سمجھ دار ہوں لیکن کچھ بن نہ پڑا تو جاب بدل لوں گی

'' انہوں نے مجھے بغور دیکھا، ''جانتا ہوں تو نڈر ہے ہمت والی ہے پر تجھے ہزار میں کوئی ایک اچھا باس ملے گا

گھر بیٹھ جاؤں گی'' میں نے جواب دیا ''

تو گھر بیٹھنے والی بھی نہیں ہے نا یہی تو سیاپا ہے سارا۔ تیری بھڑکن تجھے چین نہیں لینے دے گی تو بھنبیری ہے '' بھنبیری'' اور ہنس پڑے

تو پھر کیا کروں؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا''

'' بس زیادہ سیانی اور ہمدرد نہ بنا کر ادارے کی ''

مطلب میں بے ایمان ہو جاؤں باس کو ادارے کو نقصان ہونے دوں؟'' میں سٹپٹا گئی کہ یہ بات تو مفتی جی کی فطرت کے خلاف ہے

اوہ کڑیے میرا مطلب اے وے کہ باس نام دی نسل اصل اچ کنفیوز ہندی اے۔ انہیں سچ جھوٹ کی تمیز نہیں '' ''ہوتی۔ سب پر شک کرنا، ماتحتوں سے ایک دوسرے سے جاسوسی کرواتے رہنا عادت ہوتی ہے ان کی

ایسے تو ادارے تباہ ہو جاتے ہیں'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''

تباہ ہو تو رہے ہیں، خاص طور پر اگر باس سرکاری ہو، سفارشی ہو نا اہل ہو تو اسے کام کرنے والے زہر لگتے ہیں، '' ''اسے بس اپنی کرسی، اپنی پھوں پھاں سے غرض ہوتی ہے

ان کے عملی تجربات کا نچوڑ میرے سامنے تھا

مفتی جی کی یہ باتیں اور پیش بندیاں مجھے ان کے جانے کے بعد بہت یاد آنے لگیں۔ میں نے کئی ادارے بدلے سرکاری غیر سرکاری۔ اور ہر جگہ تمام تر خلوص اور ایمانداری کے باوجود، اچھے باس کے باوجود ایسے عناصر کی وجہ سے استعفیٰ دیا جن کی نشاندہی مفتی جی سالوں پہلے کر گیے

مجھے کہنے لگے ایک دن، ”تو بھی میری طرح شدت پسند ہے یہ عادت چھوڑ دے بندہ بڑا خوار ہوتا ہے شدت کے ہاتھوں“

” میں ہنس پڑی، ”اچھا ہے میں بھی کو کڑو بن جاوں گی

” ایہ گل فیر منہ توں نہ کڈھیں ساری عمر اگ تے دھری رہویں گی“ وارننگ دی ”

جانے اچانک کیا ہوا مفتی جی کو چپ سی لگ گیی۔ ان کے چہرے پر جیسے بتی جلنے بجھنے لگی، انہوں نے بے چینی سے کیی بار تکیے کو گود میں لے کر زور زور سے تھپکا۔ جیسے کسی خیال کو کسی یاد کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہے ہوں ۔ پھر ایک لمبی سانس لی اور گویا ہویے،

” شہابہ میری بات سن کبھی دوبارہ ایسا نہ کہنا تیری زبان کالی ہے خود کو بدعا نہ دینا ““

”سے“ اس میں بدعاوالی کون سی بات ہے مفتی جی؟ میں تو ہوں ہی مسفٹ سی بندی شروع‘

تم میری بات سمجھو یہ جو کوکڑو ہوتا ہے نا ہر طرف سے جلتا ہے، بہت دیر تک جلتا ہے پھر بھی خبر نہیں ہوتی کہ ” ’

“وہ گل جایے گا یا کوڑے میں جایے گا

ایک لمبی چپ کے بعد وہ سنبھل سے گیے اور بات ہی بدل دی۔

وہ ایسا کرتے تھے اکثر، لیکن جب ہم ہجوم میں نہ ہوتے محفل نہ ہوتی۔

محفل میں تو مفتی جی چہکتے، ہنستے چھیڑتے سب کو۔ ان کی گفتگو میں پھلجھڑیاں چھوٹتیں، پٹاخے چلتے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے، دلچسپ اور کھلے ڈلے بظاہر۔ روحانی پہلو بھی تھے مگر ڈھکے چھپے

تیسری آنکھ

وہ ماہر نفسیات تھے لکھاری تھے، اوران کی وہ تیسری آنکھ جو جسمانی آنکھ والوں کو نظر نہیں آتی تھی، بہت دور تک ،بہت اندر تک دیکھ لیتی تھی۔ ایک دن ملنے گیی تو باقی لوگ ڈرایینگ روم میں تھے اور مفتی جی اپنے کمرے میں کسی سے باتوں میں مصروف تھے۔ حسب معمول کھلے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور داخل ہو گیی۔

کچھ لوگ آیے ہویے تھے ملنے۔ بڑا سنجیدہ اور عقیدت کے چھینٹوں سے بھرا ماحول تھا۔ مفتی جی کا کویی اور ہی روپ، کویی اور ہی چہرہ تھا میرے سامنے۔

ایک عورت اور اس کا بیٹا کسی دوسرے شہر سے آیے ہویے تھے۔ مفتی جی کے پاس آنے والے لکھاریوں کو تو جانتی تھی مگر ان کے علاوہ کون کہاں سے آتا ہے؟ کیوں آتا ہے؟ کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایسے حالات میں بہانہ کر کے اٹھ جاتی۔

مفتی جی کی نظر مجھے سمجھا دیتی کہ انہوں نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے مگر کچھ نہ کہتے

اس روز خلاف معمول انہوں نے مجھے جانے نہ دیا

"بیٹھ جایو چایے پی کر جانا"

میں سمجھ گیی کہ آج 'تخلیہ' کرانہیں ہے سو بیٹھ گیی

عورت اپنے دکھڑے سنا رہی تھی ترلے کر رہی تھی کہ میرے لیے دعا کریں میرے بیٹے کی مشکلات دور ہوں۔

مفتی جی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے، "بی بی آپ کو کسی نے بہکایا ہے میں تو خود دعایوں کا طالب ہوں۔ بزرگوں کے پیچھے خجل خوار ہو تا رہا ہوں اللہ میاں کی مہربانی جو اس نے مجھے سنبھالا ہوا ہے۔ آپ غلط جگہ پر آگیی ہیں"

عورت کا اصرار تھا کہ اسے خواب میں بشارت ہویی ہے مفتی جی سے ملنے کی ایک بار نہیں تین بار سو وہ خالی ہاتھ نہیں جایے گی

"مفتی جی کہہ رہے تھے "آپ کے تصور نے آپ کو بہکایا ہے، میں تو بے حد گنہ گار عاجز سا انسان ہوں

دونوں جانب سے ناں ناں کی تکرار تھی۔ میں حیران یہ تماشا دیکھ رہی تھی کہ مفتی جی کیوں انکاری ہیں چلیں بزرگ نہ سہی بطور ایک اچھا انسان ہی سہی بے چاری کی تسلی کر دیں۔ میں نے ایک دو بار ہاتھ کے اشارے سے صلاح بھی دی مگر مفتی جی بالکل انجان بن گیے،

مجھے اندازہ ہو گیا کہ بات کچھ اور ہے۔ چایے کے بعد اس کا بیٹا شایید مایوس ہو کر یا ماں پر ناراضگی کے باعث باہر چلا گیا۔ عورت مایوس سی ہو کر اٹھنے لگی تو مفتی جی نے کہا گھمبیر سے انداز میں،

"آپکا بیٹا خود سب سے بڑی رکاوٹ ہے اپنے راستے کی اور یہ رکاوٹ آپ کی پرکھ کے لیے ہے۔ فکر چھوڑ دیں مست ہو جاییں جلد ہی سب ٹھیک ہو جایے گا"

مفتی جی کے یہ الفاظ سن کر عورت کی آنکھیں چمک اٹھیں، شدت جذبات سے اس کے آنسو بہنے لگے، وہ عقیدت کی ماری شکر گزاری اور اطمینان کے جذبوں سے لبریز، دعاییں دیتی چلی گیی۔

مفتی جی تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے دیوار پر نظریں ٹکایے پھر مجھے دیکھے بغیر کہنے لگے،

"اللہ معاف کرے"

میں جو اس سارے منظر میں بھٹکتی ہویی کہیں پس منظر میں کھو چکی تھی چونک کر بولی،

کسے"؟ "

مجھے "ان کے لہجے میں عجیب سی بات تھی میں کچھ نہ کہ سکی بس انہیں دیکھتی رہی "

" کیا کرتا اس کی حالت دیکھی نہیں جارہی تھی بزرگ بن بیٹھا "

اوہ۔۔تو کیا ھو گیا آپ نے کونسا کویی دم درود یا چلہ کشی والا کام کیا ھے ایک پریشان حال انسان کو تسلی کے دو بول " "کہے ہیں اور بس

تم نہیں سمجھتیں شہابہ وہ آیي تو کسی حد تک شک میں ہو گی میرے بارے، میں نے اسے اپنی بزرگی کی سند دے " کر بھیج دیا۔ ارے میں تو خود ساری زندگی اللہ والوں سے بھاگتا بلکہ الرجک رہا۔ کچھ بابوُں کو مان لینے سے ان کے " پاس بیٹھنے سے میں خود تو بابا نہیں بن گیانا

ایسے ہی نہ خود کو مجرم بنالیں اپنی عادت سے مجبور ہو کر، کچھ برا نہیں کیا آپ نے ڈاکٹر بھی تو مرتے مریض کو " " صحت کی ہی نوید سناتے ہیں نا! ہو گا تو وہی جو لکھا ہے۔ بہتر ہو گیا تو آپ کو دعا دے گی

" مفتی جی بے بسی سے بولے "یہی تو ڈر ہے مجھے کہیں وہ میری عقیدت میں لتھڑ نہ جایے

یعنی آپ کو یقین ہے کہ جو آپ نے کہا وہی ہو گا"میں نے کھوجا "

مفتی جی فوراالرٹ ہو گیے اپنے سامنے ہمیشہ کی طرح چق تان لی، "میلے کچیلے لوگوں کی وہ ذیادہ سنتا ہے ان کا بھرم "رکھتا ہے

" وہ کیوں "

"اپنا آپ جو منوانا ہوتا ہے اس نے کبھی پیار سے کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے "

اور اس جملے کے بعد انہوں اپنی جانب کھلتی ہوئی کھڑ کی بند کر کے میرے بچوں کی صحت بارے گفتگو شروع کر دی
! ۔ کتنے چالاک تھے مفتی جی آپ

ایک جھلک سے آگے نہ بڑھنے دیتے، شاید کشش قایم رکھنے کا گر آتا تھا آپ کو یا اجازت نہ تھی اس سے زیادہ؟

شہاب صاحب والی عادتیں آپ نے بھی اپنالی تھیں۔

!! بہت ساری باتیں ادھوری چھوڑ گیے، بہت سارے سوال تشنہ رہ گیے

ایک دن میں ملنے گی تو ان کی طبیّت بہت خراب تھی۔ امی جی نے بتایا کہ سو رہے ہیں شایید۔ میں امی جی سے بات
چیت کے بعد جانے لگی تو مفتی جی کی آواز آیی،

شہابہ آیی ہے"؟"

"میں نے امی جی سے سر گوشی میں کہا، "میں جا رہی ہوں آپ کہ دیں کہ شہابہ نہیں آیی

امی جی کہنے لگیں،

" ان کے کان بڑے تیز ہیں تم ملے بغیر چلی گییں تو چڑ چڑ کرتے رہیں گے اب مل جا "

میں نے کمرے میں جھانکا تو وہ اٹھ کر بیٹھ رہے تھے تکیوں کے سہارے، ان کے کمرے کا دروازہ بند تو ہوتا نہیں تھا
کبھی جانے کیوں؟

تم مجھے ملے بغیر کیوں جا رہی تھیں پہلے تو یہ بتایو" انہوں نے مسکرا کر کہا "

" سوچا آپ سو رہے ہیں تو تنگ نہیں کرنا چاہ رہی تھی "

انہوں نے پانی کا گلاس اا ٹھایا پیا اور کہنے لگے،

,بات سنو تنگ تو مجھے کرتے ہو تم سارے پر اب آ گے تو آرام ہی کرنا ہے نا قبر میں ”

“کرلو تنگ میں خوشی سے تنگ ہونے کو تیار ہوں

میں کچھ دیر بیٹھی اور آ گئی لیکن اس دن جانے کیوں واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے ونڈ سکرین دھندلاتی رہی نگاہوں کے سامنے

زندگی کی ونڈ سکرین بھی کبھی شفاف او کبھی کتنی دھندلی ہونے لگتی ہے

نیو کلیس

مفتی جی کیا گیے ادب برایے ادب کی محفلیں غیر محسوس انداز میں کم ہونے لگیں ۱۹۹۲ میں میری باری پر 'رابطہ' کا اجلاس میرے ہاں تھا۔ اس اجلاس میں ضمیر جعفری اور عذرا اصغر مہمان تھے۔ اتفاق سے تنقید کے لیے افسانہ بھی میرا ہی پیش ہونا تھا۔

افسانہ سنانے کے بعد سب اپنی اپنی رایے دے رہے تھے۔ سبھی نے افسانے کو خوب سراہا حالانکہ مثبت انداز کی تنقید بھی ہوا کرتی تھی ان اجلاسوں میں۔ مفتی جی اگرچہ بیمار تھے لیکن ضمیر جعفری کی موجودگی میں کھل اٹھے تھے۔

" کہنے لگے، "منشا اور شہابہ کی ایسی سازش آیندہ کامیاب نہ ہونے دینا معزز ممبران

سب نے حیرت سے مفتی جی کی جانب دیکھا، وہ شرارت سے مسکرا رہے تھے، منشا یاد نے پوچھا، "کونسی سازش کیسی سازش"؟

مفتی جی نے حاضرین پر ایک طایرانہ نظر ڈالی، "بات یہ ہے صاحبو کی ہم ہیں سب مروت والے لوگ، منشا نے جان بوجھ کر کھانا اور افسانہ ایک ہی جگہ رکھا، اب نمک حلالی تو کرنے پڑے گی، سو افسانہ بہترین ہے شہابہ تیرا" اور سیدھے ہو کر بیٹھ گیے۔

ایک زوردار قہقہہ پڑا اور منشا جی اپنی صفاییاں پیش کرنے لگے،

ایک ممبر نے وقت پر افسانہ نہیں تیار کیا تھا اپنی باری پر سوشہابہ کی میزبانی میں ہی اس کو کٹہرے میں کھڑا کرنا، ” بلکہ اس کے لیے داد دہری کہ کڑی تنقید بھی ہو سکتی تھی پر افسانہ واقعی شاندار نکلا کھانے کی طرح، اب کیا ہو سکتا ہے؟ “

! کتنے بڑے لوگ تھے اور کیسے ظرف والے۔

اس اجلاس اور افسانے کی روداد ضمیر جعفری نے روزنامہ 'خبریں' میں اپنے کالم 'ضمیر حاضر ضمیر غایب' میں بھی لکھی تھی۔

مفتی جی کے جانے کے بعد بہت کچھ بدل گیا۔ وہ جاندار قسم کی ادبی محفلیں، وہ دل سے عزت کرنے، بغیر جتلایے بغیر کسی صلے تربیت کرنے والے اب کہاں؟

کچھ سال پہلے ابدال بیلا سے اتفاقاً ملاقات ہویی۔ لگا پھر سے تازہ ہوا آنے لگی ہے کہیں سے۔ ان تازہ جھونکوں کے ساتھ کچھ زرد پتے بھی ہرے ہونے لگے اپنی تمام تر رعنایوں کے ساتھ۔

ایک دن بیلا نے فون کیا مفتی جی بہت یاد آ رہے ہیں آج، ان کی آواز بھیگی ہویی تھی۔ یہ وہ مونچھوں کو بل دینے ! والے بیلا نہیں تھے، نہ آواز میں دبدبہ نہ مونچھ پر بل۔ یہ تو کویی اور ہی تھا منمناتا ہوا عاجز سا بندہ

میں نے کہا آجاییں مل کر ان سے باتیں کرتے ہیں کیونکہ مجھے تو وہ کبھی بھولتے ہی نہیں

سردیوں کی بارش، موسم میں معمول سے زیادہ خنکی تھی۔ ہم دونوں لایونج میں ہیٹر کے سامنے فلور کشنز پر ہی بیٹھ گیے۔ ہیٹر جلتا رہا، بشیر چاچا کافی بنا بنا کر لاتا رہا، باہر بارش کی بوندیں اور اندر ہمارے آنسو بہے جا رہے تھے۔ مفتی جی ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھ گیے تھے کہیں۔

بس وہی تھے چاروں طرف، ہم دونوں کبھی باتیں کرنے لگتے، ایک دوسرے سے خود سے، کبھی خاموش سر جھکا کر بیٹھ جاتے، صرف خاموشی باتیں کرتی۔ عجیب کیفیت نے گھیر رکھا تھا اس دن مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کچھ لوگ آپ کی ذات میں یوں جذب ہو جاتے ہیں کہ واقعی، رگوں میں دوڑنے والی بات سچ لگتی ہے۔

!مفتی جی ایسے ہی تھے

میں اور بیلا ایک ہی نیوکلیس کے گرد گھومتے رہے جانے کب تک؟

کتنی عجیب بات ہے کہ مفتی جی کی زندگی میں ابدال بیلا سے میرا واسطہ بس سلام دعا تک رہا۔

پھر اچانک سالوں بعد ملے اور یوں کہ ہم بنا کچھ کہے ایک دوسرے کے کرب کی شدت کو محسوس کر رہے تھے، شاید اس لیے کہ دکھ سانجھا تھا گرو سانجھا تھا۔

اس کے بعد بیلا سے جب بھی ملتی، بات ہوتی، ہمیں مفتی جی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا

!آنسو، آنسو اور صرف آنسو

من کا صحن خشک ہونے ہی نہیں پاتا تھا ہمیشہ گیلا ہی رہتا تھا۔

!اب بھی گیلا رہتا ہے مگر اب اس پر چلتے ہوئے میرے قدم ڈگمگاتے نہیں

ہمارے ہاں سیاست دان، بیوروکریٹ، لکھاری، مزہبی رہنما، تعلیمی رہنما یا کاروباری بندہ ہو، جب تک ڈوریاں ہلانے والے دیدہ و نادیدہ ہاتھوں کے اشاروں پر نہیں چلے گا اسے اس کا جایز مقام نہیں مل سکتا یہی اس قوم کی بد قسمتی ہے۔

مفتی جی اور شہاب صاحب پر بھی بڑے پتھر اچھالے گیے۔ ان کی شخصیت اور فن کو متنازعہ بنانے کے علاوہ انہیں ان کے مقام سے محروم کرنے کی بھونڈی کوششیں کی گییں، آنے والی نسلوں کو ان کے بارے جانے کیا کیا الٹا سیدھا بتایا جاتا رہا اور بتایا جا رہا ہے۔

میں چونکہ دونوں 'اصلی بابوں' کے قریب رہی، سو اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر بڑی ذمے داری کے ساتھ یہ لکھ رہی ہوں کہ وہ دونوں بہت برگزیدۃ، ایمان دار، سچے، کھرے اور انسان دوست شخصیات تھیں۔ انسان دوست اس لیے کہ رہی ہوں کہ ہر انسان اندر سے انسان دوست نہیں ہوتا۔ اکثر نمایشی، ڈھکوسلے ہوتے ہیں، خود کو نمایاں کرنے کی چالیں !

کیی بار میں ان کے بارے میں الٹے سیدھے سوال سنتی ہوں طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ،

اپنی سی کوشش کرتی زبانی جواب بھی دیتی رہی لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شاید یہ کتاب اسی لیے لکھوا رہا ہے کویی مجھ سے کہ میں سچ لکھوں اور سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں !

سچ تو یہ ہے

مفتی جی کی 'گوپیوں' کے بڑے چرچے کیے گیے، ان گوپیوں کی اصلیت محض اتنی سی تھی کہ مفتی جی سے عقیدت رکھنے والی ان کی مداح خواتین کو چونکہ ان سے کسی قسم کا خطرہ تھا نہ تھریٹ، سو وہ انہیں آزادانہ ان کے گھر میں ہی ملنے چلی آتیں مفتی جی کی بات چیت کا انداز کھلاڈلا تھا جیسے کویی سہیلی دکھ سکھ بانٹے، ایک سراہنے والا گفتگو کرے۔

ہر عورت کسی نہ کسی حوالے سے ستایی ہوتی یا احساس کمتری کی ماری ہوتی، اسے بانس پر چڑھا دیتے۔ اس کی تعریفیں کرتے اسے اعتماد بخشتے، کیونکہ وہ بنیادی طور پر استاد اور ایک ماہر نفسیات تھے۔ عورت لکھاری ہوتی تو حوصلہ دیتے بلکہ لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتے کہ لکھو!

وہ تو مفت میں جانے اسی قوم کی کتنی بیٹیوں کو نیی زندگی بخش گیے، کتنے گھر اجڑنے سے بچ گییے، کتنے بچے رلنے سے بچ گیے، لیکن یہاں قوم کی کسے فکر ہے؟

رایٹرز گلڈ ایوارڈ انہی سینیرز نے بنایا تھا تو پھر مفتی جی اور شہاب صاحب کی کتابوں کو کیوں ایوارڈ نہ ملے اگر وہ ایک دوسرے کو پروموٹ کرتے تھے؟

ایک دن ایک جرنلسٹ نے بہت سیانا بن کر میری بات پر بھنویں چڑھاییں، "ہوں، مفتی جی کا گھر ایف سکس میں تھا؟ واہ" انداز طنزیہ، میں اس کے اندر کا سوال سن سکتی تھی

میں نے اسکی تصحیح کرتے ہویے اسے بتایا کہ اس وقت اسلام آباد میں لوگ آباد ہونے سے گھبراتے تھے۔ آج کے مہنگے ترین سیکٹرز میں بھی پلاٹ بہت کم قیمت اور قسطوں پر سی ڈی اے آفر کرتا تھا۔ منتیں کی جاتیں تھیں

کیونکہ نیا شہر بسانا تھا ایک سنسان وادی میں جو جنگلوں میں گھری ہوئی تھی، جہاں کوئی سہولیات بھی نہ تھیں۔ بجلی پانی، نہ سڑکیں، نہ ٹرانسپورٹ، ہر جانب اجاڑ ویران جنگل اور جانور!

لوگ شک کی کیفیت میں تھے کہ یہ منصوبہ کامیاب بھی ہو گا یا نہیں؟ محض کاغذی وعدے تھے اور بس! بلکہ یہ بھی سنا ہے کہ پہلے پہل حکومت نے الٹا پیسے دیے زمین لینے والوں کو۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے معلوم نہیں لیکن قسطوں والی بات سو فی صد درست ہے۔

مفتی جی کا پلاٹ جب لیا گیا تو تیرہ چودہ ہزار کی آسان قسطوں پر ملا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بہت بعد

میرے والدین نے ۱۹۷۴ میں ۷ امرلے کا پلاٹ ۱۶ ہزار میں لیا تھا وہ بھی قسطوں پر!

ہم لوگ کاش کسی کی مخالفت میں سنی سنائی پر یقین کرنا چھوڑ دیں، تحقیق کریں تو ہماری ذاتی اور قومی زندگیوں میں انقلاب آ جائے لیکن شاید ہمارے 'آقا' اور ان کے زرخرید گماشتے یہ نہیں چاہتے۔

سو ہم افواہوں اور سنسنی خیزی کے غباروں میں ہوا بھرتے چلے جاتے ہیں، ہیجان پیدا کرتے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں، یہی ہمارا پسندیدہ مشغلہ بھی ہے تفریح بھی اور المیہ بھی!

اصل کہانی یہ ہے کہ جن کے ہاتھوں میں ہم نے اپنی قسمت کے فیصلے دے دیے ہیں انہیں اصلی پاکستانی اور اصل اسلام پر چلنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے ان کو ہر طرح دبانے کی، دیوار سے لگانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

شاہ سے زیادہ شاہ کے مصاحب اس کام میں پیش پیش رہتے ہیں جو ٹھا کھانے کے عادی یہ لوگ بس یہی کچھ کر سکتے ہیں۔

ان کے پروگرام کا حصہ وہ نام نہاد مذہبی لیڈر ہوتے ہیں جو اسلام کے مختلف برانڈ سادہ لوح دینی و دنیاوی تعلیم سے عاری عوام میں بیچ کر انہیں تقسیم کر سکیں، انہیں ہر طرح محکوم بنا کر چھوڑیں۔

آقاؤں' کو 'لبرل' بھی وہی پسند ہیں جو دوسروں کے گھروں کی عورتوں اور بہنوں بیٹیوں کو 'میرا جسم میری مرضی' کے اصول پر چلا سکیں۔ حیرت ہے کہ نام نہاد لبرلز کی سوئی صرف جسم پر ہی کیوں اٹکی رہتی ہے؟

لبرلزم' لفظ تو بہت گہرائی رکھتا ہے اپنے دامن میں، جہاں افراد، معاشرہ اور قوم سبھی کی اہمیت ہوتی ہے، سبھی کو' بگاڑ سے بچانے کے لیے ایسے راستے ایسے اصول وضع کیے جاتے ہیں جو قوموں کو معاشروں کو مثبت سمت میں لے کر چلیں؟ کیا لبرلزم محض جنسی بھوک کو تیز تر کرنے، عورت کو برہنہ کرنے اور وحشت پھیلانے کا نام ہے؟

اسلام سے زیادہ بہترین اور متوازن معاشرت کوئی سسٹم پیش نہیں کر سکتا سو جو بھی اسلام کا صحیح چہرہ دکھانے کی کوشش کرے گا زیر عتاب آئے گا!

یہی ہوا مفتی جی اور شہاب صاحب اور ان جیسے جانے کتنوں کے ساتھ کہ ہم تو لکھاری برادری کی ہی بات کر سکتے ہیں پورے وثوق کے ساتھ!

پاکستان دشمن طاقتوں کا طے شدہ ایجنڈا ہے بے راہ روی، خاندانی نظام کی تباہی اور اسلام سے دوری، تاکہ پاکستان وہ طاقت نہ حاصل کر لے جس سے وہ خائف ہیں۔

اسلام کے سارے معاشی، کاروباری اور عدالتی نظام کو انہوں نے خود عملی طور پر اپنا لیا، خود خاندانی نظام کی جانب لوٹ رہے ہیں، زیادہ بچے پیدا کرنے پر عورتوں کو انعامات دے رہے ہیں اور ہمیں وہ اپنا ناکارہ، ناکام جنسی آزادی کا تجربہ منتقل کر رہے ہیں نام نہاد لبرلز کے ذریعے۔

مفتی جی جب تک مغربی دانشوروں کو پڑھتے رہے، قرآن اور اسلام سے دور رہے، دہریت کے قائل تھے لیکن انکی دہریت کا بھی جنسی بے راہروی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

انہوں نے تو 'علی پور کا ایلی' میں اپنی ایک محبت کے ذکر کو بھی اپنی برائی بنا دیا۔ یہاں ادب اور ثقافت کے نام پر جس طرح غاروں کے انسان کی یاد دلائی جاتی ہے سب کے سامنے ہے۔

مفتی جی اور شہاب صاحب کو پس منظر میں دھکیلنے کا کام انہی 'آقایوں' کے اشاروں پر ہوا جو اسلام کی اصل صورت دکھانے والوں سے خوفزدہ ہیں۔ انکے حواری بس دو طبقات ہیں ذہنی طور پر جنسی مریض اور زر و اقتدار کے بھوکے !

میرے گرو اور گرو کے مرشد کا یہی کہنا تھا کہ کسی کو بد عانہ دو، کوشش کرو کویي ڈگمگاتا سنبھل جایے۔ نہیں سنبھلتا تو خود دور ہو جایو اور اس کے حق میں دعا کرو۔ اتنا حوصلہ ؟

!بہت تپسیا کرنی پڑتی ہے آپ تو جانتے ہیں گرو جی

مفتی جی ! کہا تھا نا میں نے آپ پر کتاب لکھوں گی اور آپ نے ایک معنی خیز قہقہہ لگایا تھا بس۔ کہا کچھ نہیں تھا اس قہقہے کا مطلب آج سمجھ میں آتا ہے

! قبول کیجیے میری عاجزانہ سی کوشش